خدیجہ مستور کے ناولوں میں تقسیم کا المیہ: نسوانی کرداروں کے حوالے سے

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار

شعیب احمد وانی

نگران

ڈاکٹر نصرت جبین

شعبۂ اردو

سینٹرل یونی ورسٹی آف کشمیر

دسمبر ۲۰۱۸

CERTIFICATE

This Dissertation titled, **"Khadija Mastoor Ke Navilon mein Taqseem Ka Almiya: Niswani Kirdaron Ke Hawale Se",** submitted by **Shahieb Ahmad Wani** in partial fulfilment of the requirements for the award of **Master of Philosophy in Urdu**, is an independent and original piece of research work carried out under my supervision. This research work has not been submitted, in part or in full, to any university institute for any degree. The candidate has fulfilled all the statutory requirements for the submission of this dissertation.

Place: Srinagar

Date:

Supervisor

Dr. Nusrat Jabeen

فہرست

حلف نامہ

میں بہ حلف اقرار کرتا ہوں کہ میں نے یہ مقالہ بعنوان ''**خدیجہ مستور کے ناولوں میں تقسیم کا المیہ: نسوانی کرداروں کے حوالے سے**'' برائے حصولِ سند ماسٹر آف فلاسفی خود تحریر کیا ہے۔ میں نے اس تمام تر مقالے میں تحقیق کے اصول وضوابط کو مدِ نظر رکھ کر سرقے سے اجتناب کیا ہے۔ اگر اس مقالے میں تحقیق کے حوالے سے کوئی کوتاہی پائی جاتی ہے تو اس صورت میں یونی ورسٹی میرے خلاف کوئی بھی کارروائی کر سکتی ہے۔

Research scholar:

Supervisor/Guide:

Dean/Head of Deptt.

Date:

Place:

آدم جی انعام یافتہ ناول نگار "خدیجہ مستور" برصغیر ہندو پاک کے علمی ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ان کا شمار اردو کی چند بڑی اور اہم ناول نگار خواتین میں ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں یوں تو بہت سارے مسائل کو اجاگر کیا ہے مگر تقسیم اور فسادات کے حوالے سے ان کے ناول مناسب اہمیت رکھتے ہیں۔اس موضوع پر اگرچہ متعدد ناول نگاروں نے بہت سے قابلِ قدر اور اہم ناول لکھے ہیں جن میں قرۃ العین حیدر کا "سفینۂ غمِ دل"، "آگ کا دریا"، "آخرِ شب کے ہمسفر" اور "میرے بھی صنم خانے"۔عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں"۔کرشن چندر کا "مٹی کے صنم"، رامانند ساگر کا "اور انسان مر گیا" حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول" وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔مگر خدیجہ مستور کے ناول تقسیم، ہجرت، فسادات اور اس دور کے معاشرے کے حوالے سے بے مثال نمونے ہیں۔ان ناولوں میں تقسیم ملک کی نہ صرف تاریخ مل جاتی ہے بلکہ پیش کردہ موضوع ومواد کے اعتبار سے اس دور کا جیتا جاگتا معاشرہ بھی نظر آتا ہے۔اس نسل کو جس المیہ سے سابقہ پڑا اس کا درد و کرب تو ملتا ہی ہے ساتھ ساتھ اس نے پورے معاشرے کو کیسے اپنی آغوش میں لے لیا اس کے واضح نمونے بھی مل جاتے ہیں۔اس کے لئے انہوں نے کئی سماجی، تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی تحریکوں کا جایزہ لیا ہے اور ان کا ماہرانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔

ان ناولوں کے بعد ہی ان کا شمار ایک سنجیدہ اور گہری سوچ رکھنے والی تخلیق کار کی حیثیت سے ہونے لگا تھا۔یوں تو انہوں نے ناولوں کے علاوہ پانچ افسانوی مجموعے بھی لکھے ہیں، مگر ان میں سے ان کے ناول ہی اس قدر توانا ثابت ہوئے ہیں جنہوں نے ان کے نام کو زندہ و جاوید رکھا ہوا ہے۔نہ صرف یہ کہ یہ ناول اردو ادب میں زندہ رہیں گے بلکہ ان کے خالق کی حیثیت سے خدیجہ مستور کا نام بھی اردو ادب

میں نمایاں حیثیت کا حامل بن چکا ہے۔ان کی کہانیوں میں ۱۹۴۷ء کے المیہ کے ساتھ ساتھ خاندانی بکھراؤ کے سانحات، ہجرت کے بعد پاکستان میں تبدیل ہوتے ہوئے الم ناک واقعات، حقایق اور کربوں کی ازیت ناک داستانیں بھی ہیں۔فکشن میں طبع آزمائی کے علاوہ انہوں نے ریڈیو کے لئے بھی دو ڈرامے لکھے۔بچوں کے لئے بھی چند کہانیاں لکھیں۔ان کی بہت سی کہانیوں کا ترجمہ غیر ملکی زبانوں میں بھی ہوا ہے۔آپ کچھ عرصہ روزنامہ ''امروز'' کے لئے کالم بھی لکھتی رہیں اور کچھ وقت تک انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور شاخ کی سیکرٹری بھی رہیں۔ملتان رائیٹرز گلڈ کی ایک اردو محفل میں پڑھے جانے والے ان کے افسانے ''راستے'' کو ۱۹۶۴ء کا بہترین افسانہ قرار دیا گیا۔

خدیجہ مستور کا فن ان کی شخصیت اور ماحول کا حسین امتزاج ہے۔ان کے نسوانی کردار ان کی شخصیت کا پرتو نظر آتے ہیں۔وہ صرف چار فٹ گیارہ انچ کی مختصر قامت رکھتی تھیں۔مگر اپنی صلاحیتوں اور کارناموں کے پیش نظر بڑی قد آور شخصیت کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں۔انہوں نے اپنے فن اور اسلوب کے ذریعے سے اردو ادب کی جو خدمات سرانجام دی ہیں انہیں تاریخ اردو میں ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔انہوں نے فکشن کو خیالی دنیا اور خدوخال کی تنگنائیوں سے نکال کر حیات و کائینات اور حقیقت کے سانچے سے ہم آہنگ کیا۔

منتخبہ موضوع ''خدیجہ مستور کے ناولوں میں تقسیمِ برصغیر کا المیہ:نسوانی کرداروں کے حوالے سے'' میرے لئے کسی چلینج سے کم نہ تھا۔مذکورہ موضوع کی نوعیت اور ماہئیت دیکھ کر بڑے بڑے جیالوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں کیونکہ تقسیم برصغیر کا المیہ مشترکہ تہذیب،آپسی بھائی چارہ،مذہبی رواداری،انسیت اور محبت سب کچھ چھین کے ہم کو اس دورائے پر چھوڑ آیا جہاں سے سوچنے کی راہیں معدوم ہوگئیں اور بالآخر کوئی نتیجہ اخذ کرنا جانبداری کے مترادف سمجھا گیا۔اس لئے یہ موضوع اپنے آپ

میں میرے لئے ایک چیلنج سے کم نہ تھا۔ بہر کیف شوق آو دیکھے نہ تاو اسی مفروضے پر عمل پیرا ہو کے میں اپنے تحقیقی سفر کے سمندر میں کود گیا۔ سینٹرل یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کا کتب خانہ، یونی ورسٹی آف کشمیر کے شعبۂ اردو اور ریلجس ڈیپارٹمنٹ کے کتب خانے، علامہ اقبال لائبریری (مرکزی کتب خانہ)، میزان پبلشرز اور پاسورڈ بک ڈیپوز وغیرہ کو کھنگال کر اپنے موضوع سے جڑا قلیل مگر قابلِ اعتبار مواد اکھٹا ہو پایا۔ جس میں سے ''اردو ناول آزادی کے بعد'' از ڈاکٹر اسلم آزاد، ''برِ صغیر میں اردو ناول'' از ڈاکٹر خالد اشرف اور ڈاکٹر محمد نسیم کی کتاب ''اردو ناول پر تقسیمِ ہند کے المیے کے اثرات'' اس موضوع کے حوالے سے میرے لئے زیادہ سودمند ثابت ہوئیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سید جاوید اختر کی کتاب ''اردو کی ناول نگار خواتین'' بھی بہت مددگار ثابت ہوئی۔ مذکورہ مصنف کی کتاب نے کافی اہم معلومات فراہم کی۔ سرسری مطالعہ سے یہ اخذ ہوا کہ موصوف کی تصنیف کا مطالعہ اردو داں طبقے سے جڑے حضرات کو اپنے مفاد کے لئے گہرائی سے کرنے کی ضرورت ہے۔ ۲۰۱۱ء میں میزان پبلشرز سے شائع شدہ شاہینہ اختر کی تنقیدی کتاب ''تقسیم ہند اور ناول 'کر ماں والی'' بھی میرے مطالعے میں آئی جس نے جگہ جگہ میرے موضوع کی راہ نمائی فرمائی۔

راقم نے اپنے اس تحقیقی مقالہ کو درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول: خدیجہ مستور کے ناولوں کا اجمالی جائزہ:

راقم نے اس باب میں خدیجہ مستور کے ناولوں کے تعلق سے تحقیقی مواد جمع کر کے ان کے اسلوب، موضوع، کردار نگاری، پلاٹ اور مکالمہ نگاری پر سیر حاصل اور مدلل گفتگو کی ہے۔ دونوں ناولوں کے پسِ منظر اور پیش منظر کو عیاں کر کے قارعین کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنے کی سعی کی ہے۔

باب دُوم: اردو ناول میں تقسیمِ برصغیر کا المیہ: خواتین تخلیق کاروں کا عمومی جائزہ:

باب دوم میں راقم نے اردو کی خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کا گہرا مطالعہ کر کے تقسیم برصغیر کے پسِ منظر اور پیش منظر میں پیدا شدہ حالات کا جایزہ پیش کر کے اردو کی برجستہ خواتین ناول نگاروں کے ناولوں میں تقسیم کے المیے پر مفصل بحث کی ہے۔ تقسیمِ برصغیر کے حوالے سے خواتین تخلیق کاروں میں چونکہ جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، رضیہ بھٹ اور خود موصوفہ یعنی خدیجہ مستور ہی نمایاں ہیں اس لئے انہی تخلیق کاروں کے ناولوں کا گہرا مطالعہ کر کے تقسیمِ برصغیر کی حقانیت اور اس کی پیچیدگیوں پر بحث کرنے کی سعی کی ہے۔

باب سوم: خدیجہ مستور کے ناولوں میں تقسیمِ برصغیر کا المیہ:نسوانی کرداروں کے خصوصی حوالے سے:

باب سوم میں راقم نے پہلے خدیجہ مستور کے دونوں ناولوں کا گہرائی اور گرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے ان میں تقسیم کے موضوع کی مناسبت سے موزوں عبارات کا بہ غور مطالع کر کے ان کو خیالات کے قالب میں ڈھال کر الفاظ کے جامہ میں پہنا دیا۔راقم نے مصنفہ کے ناولوں کے حوالے سے تقسیم اور ہجرت کا جائزہ ان کے ناولوں کے پسِ منظر کے تناظر میں انجام دیا ہےاور اس سب مطالعہ اور مشاہدہ کے دوران مصنفہ کے ناولوں میں جن نسوانی کرداروں کو بروئے کار لایا گیا ہے ان کی سیرت اور کارناموں سے بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

باب چہارم: ماحصل:اس باب میں راقم نے گذشتہ ابواب میں سامنے آنے والے نتائج وعواقب کو ضبطِ تحریر میں لانے کی بھرپور سعی کی ہے۔خاص طور پر ان کے ناولوں میں تقسیم اور ہجرت کے حوالے سے جو منفرد کام ہوا ہے اور عورتوں کے حوالے سے جو دل دہلا دینے والے مناظر افشا ہوئے ہیں اس کا خاکہ قارئین کے سامنے لانے کی طالبِ علمانہ سعی وجہد کی ہے۔

کتابیات کے حوالے سے راقم نے ان تمام کتب ورسائل کی فہرست پیش کرنے کی کوشش کی ہے

جو تحقیقی مقالہ لکھنے کے وقت راقم کو درکار رہیں۔

اپنے اس تحقیقی مقالہ کے تعلق سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ مقالہ متذکرہ موضوع کے حوالے سے حرفِ آخر نہیں ہے۔ اس میں بہت ساری خامیاں رہیں ہوں گی جن کی طرف ابھی میرا دھیان نہیں ہوا ہوگا لیکن ایک بات جو میں تمام قارئین کو وثوق کے ساتھ کہنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ میں نے اپنی استطاعت کے مطابق اس موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور موضوع سے بھرپور نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اظہارِ تشکر:

تمام تعریف اور حمد اس ذاتِ واحد ولاشریک کے لئے ہے، جس کی صفتِ رحمان و رحیم نے انسان کو بیان کے وصف سے متصف کر کے انسانوں کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائض کر کے ہم کو اپنا بندہ ہونے کا شرف بخشا۔ ابد تک اس ہستی پر درود وسلام ہو، جس نے قرآن کی نعمت پائی اور پھر انسان کو جہنم کی کھائی سے نکال کر جنت کی راہ دکھانے کے لئے اپنی جان گھلا دی۔ اللہ اور رسول ﷺ کے بعد میں اپنے والدین (غلام محمد وانی اور نسیمہ بانو) کا شکرگزار ہوں جن کی دعاؤں اور جفاکشی نے مجھے تحقیق کے اس مقام تک لا کھڑا کیا۔

ایم۔فل کے اس مقالے کی تکمیل کے لئے مجھے بہت سارے مد و جزر سے گزرنا پڑا ہے اور اس حوالے سے اگر کچھ لوگوں کا دستِ شفقت میرے سر پہ نہ رہتا تو اس کام کو انجام تک پہنچانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اس تناظر میں سب سے پہلے میں اپنی نگراں محترمہ ڈاکٹر نصرت جبیں صاحبہ کا صمیمِ قلب سے شکرگذار ہوں جنہوں نے مقالے کی تکمیل کے لئے ہر دم میری رہنمائی فرمائی اور اپنے مفید مشوروں سے نواز کر میرے لئے اس جادۂ دشوار کو آسان بنانے میں میری مدد کی۔ اللہ ان کو جزائے خیر سے نوازے۔ میرا دل اپنے رفیق اور شفیق اُستاد ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی صاحب کے لئے بھی شکر و سپاس کے گیت گاتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہے جنہوں نے ایم۔اے کے دور سے ہی مجھ پر دستِ شفقت رکھا اور تب ہی سے تحقیق کے لئے حامی بھرنی شروع کی تھی۔ انہوں نے اس سفر کے دوران ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے

میری حوصلہ افزائی فرمائی اور تکنیکی امداد بھی پیش پیش رکھی۔شعبۂ اردو کے سابق صدر اور ڈین اسکول آف لنگویجز پروفیسر نذیر احمد ملک صاحب کا بھی میں احسان مند ہوں جنہوں نے اس مقالے اور موضوع کو میرے لئے تشکیل دیا۔اللہ انہیں جزائے خیر عطا کرے۔سینٹرل یونی ورسٹی کے محافظِ کتبخانہ [لائبریرین] محترم فیروز صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مقالے کی تیاری کے دوران کارآمد کتابیں ہمیشہ مختص رکھیں۔میرا دل آئی۔ٹی ڈیپارٹمنٹ کے 'عمر صاحب' اور 'مظفر صاحب' کے لئے بھی شکروسپاس کے کلمات ادا کرنے پر مجبور پا رہا ہے جنہوں نے تحقیقی کام کے دوران '' Browsing section '' کی چابی ہی ہماری تحویل میں رکھی جس سے ہماری تحقیقی سے منسلک لگ بھگ تمام کام آسانی سے انجام پا گئے۔اللہ ان کو بھی جزائے خیر عطا کرے۔

اپنے دوست نظیر احمد گنائی کا میں انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے بڑی ہی تنگنائی کے باوجود بھی دہلی سے میرے لئے مقالے کی تکمیل کے لئے بنیادی مواد دستیاب فرمایا۔اپنے رفیق اور شفیق دوست سفدر علی ڈار کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں جس نے تنگ دامنی کے باوجود بھی اس مقالے پر نظر ثانی کی زحمت گوارا کی۔ناسپاسی ہوگی اگر میں ربانی بشیر اور یونس احمد ٹھوکر کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا نہ کروں، جنہوں نے تحقیقی کام کی انجام دہی کے لئے اپنے '' لیپ ٹاپس Laptops '' میرے لئے مختص رکھے۔جاوید احمد شاہ کا بھی میں تہہ دل سے شکرگزار ہوں جنہوں نے اس کام میں میری تکنیکی مدد فرمائی۔اپنے بھائیوں اور بہنوں کا میں احسان مند ہوں جنہوں نے مجھے اس دوران تمام تر مصروفیات اور کاموں سے فارغ کر کے گھر کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا۔

میں ان تمام ساتھیوں کا مشکور و ممنون ہوں جنہوں نے اس مقالے کی تیاری میں کسی بھی طریقے کا تعاون کیا۔سرِ دست میں آپ کا ممنون ہوں کہ مجھ ناچیز کا یہ تحقیقی مقالہ آپ کے ہاتھوں کی زینت بنا ہوا ہے۔

شعیب احمد وانی
سینٹرل یونی ورسٹی آف کشمیر
نوگام، سری نگر

باب اول

خدیجہ مستور کے ناولوں کا

اجمالی جائزہ

خالقِ کائنات نے اس دنیا کی تخلیق کتنے حسین پیرایے میں کی ہے۔لاتعداد اور رنگ بہ رنگی مخلوقات کوخلق کر کے انسانوں کواشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کر دیا ہے۔انسان کو گوشت پوست کی ساخت عطا کر کے میدانِ عمل کی طرف روانہ کر کے گویا آلام ومصائب کے نہ تھمنے والے بحرِ بیکراں کے ساتھ واستہ جوڑا ہے۔میدانِ عمل[دنیا] میں انسان کی تشریف آوری پھولوں کے ہار کے استقبال سے نہیں ہوئی بلکہ یہاں پر انسان کو ہمیشہ کانٹوں کے اوپر سے ہو کے گزر کر مد وجزر کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اس دنیا میں انسانی مخلوق کا آغاز گرچہ صرف ایک جوڑے سے کیا گیا مگر وقت کی برق رفتاری کے ساتھ ساتھ آدم زادوں کی ذریّت میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور دھیرے دھیرے انسانوں کے رہنے کے لئے زمین تنگ پڑنے لگی۔وقت کے ساتھ ساتھ ایک طرف جہاں انسانی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا گیا دوسری طرف مسائل میں بھی روزافزوں اضافہ ہوتا گیا۔انسانوں کو معاشی،سیاسی،سماجی اور مذہبی سطح پر اَن گنت چلینجوں کا سامنا کرنا پڑا جن سے انسانیت ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا ہوگئی۔متفرق مسائل میں حاکم اورمحکوم[غلام اورآقا] کا مسئلہ ایک بڑا مسئلہ سر اٹھا کر کھڑا ہوا۔اس مسئلے نے تاریخِ انسانی میں وہ سیاہ باب رقم کیے ہیں کہ پڑھتے ہی وحشت ہوتی ہے۔تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا باب ہوگا جہاں پر حاکم ظالم اورمحکوم مظلومیت کا شکار نہ رہا ہو۔محکومیت ایک انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی اور رسوائی ہوتی ہے،یہ ایسا خسارہ ہے جس کا ازالہ آنے والی نسلیں پُر کرنے سے قاصر ہی رہتی ہیں۔غلامی سچ میں ایک بدترین چیز ہے جو انسان سے جیتے جی سب کچھ چھین لیتی ہے۔یہ ایک سیاہ چاہ ہے جو انسانی اذہان پر ایسے کالے پردے حائل کرتی ہے جہاں سے اچھائی اور بُرائی میں فرق کرنا ان کے بس میں نہیں رہتا۔یہ لوگوں میں اچھے خیالات پیدا نہیں ہونے دیتی ہے،لوگ جسمانی آزادی کے ساتھ ساتھ ذہنی آزادی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں،لوگوں کی اختراعی قوت صلب ہو جاتی ہے،لوگ اگرچہ ظاہری طور پر آزاد ہوتے بھی ہیں لیکن ان کی

سوچ غلامی کی جیلوں کی تہہ خانوں میں بُری طرح قید ہوتی ہے۔لوگوں کی سوچوں اور عملی زندگی میں واضح فاصلے بڑھ جاتے ہیں۔اذہان میں ایسا زنگ لگ جاتا ہے کہ لوگ تعمیر اور تخریب کے معنی میں تفاوت کرنا بھول جاتے ہیں۔غلامی میں ایک فردِ بشر کو ہمیشہ پُر پیچ وادیوں سے سفر کرنا پڑھتا ہے،اس میں اتنی قوت نہیں رہتی کہ صبر وثبات سے مصائب کا مقابلہ بھی کر پائے ،اس طریقے سے اس کے لئے ہمیشہ غیرت پے قائم رہنا جوئے شیر کے برابر ہوتا ہے۔بے جا مظالم سہتے سہتے ان حالات میں ایک انسان عزت اور ذلت کے معنی میں تفاوت کرنا بھول جاتا ہے۔مغلوب قوم کو ظالم قوم کے سامنے ہمیشہ اپنے آپ کو مطعی وفرماں بردار ثابت کرنا پڑھتا ہے اور اگر کبھی انہوں نے ہوشیار اور بیدار ہونے کی غلطی کی تو پھر ان کو زمین پر پیٹ کے بل رینگنے کا حکم نامہ جاری کیا جاتا ہے۔غلامی میں سکون اور مسرت نام کی کوئی چیز پنپنے نہیں دی جاتی، وہاں کی بزم اور رزم برابر درجہ کی ہوتی ہے اور ہر آن انسان کو درد وغم ،مایوسی ،بے بسی، تلخ اور کڑی سچائیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔فکر ونظر میں پختگی کی آمیزش مظلوم قوم کے لئے موت کے پیغام کے مترادف ہوتی ہے۔انگریزوں کی غلامی بھی متحدہ ہند کے مسلمانوں پر یکساں مہر ثبت کر گئی۔غلامی کی چکی میں وہ ایسے پسے ہوئے تھے کہ ان کو بھنک بھی نہ ہوئی کہ آیا تقسیم ہمارے مفاد میں ہوگا یا اس سے ہم کو کوئی خسارہ بھی درپیش آ سکتا ہے۔غلامی کی اندھیری رات نے ذہین طبقے کے ذہنوں کو بھی مفلوج کیا تھا وہ بھی انگریزوں کے بچھائے ہوئے اس جال کے آسانی سے ہتھے چڑھ گئے۔جانے انجانے میں Mountbatten Plan کو قبول کرنے والے کانگریسی اور لیگی شاید اس plan کی زہرناکی سے واقف نہ تھے جو فرنگیوں نے اس پالسیی کے در پردہ مرتب کی ہوئی تھی۔بہرحال انگریز اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے۔انہوں نے اپنی منصوبہ بندی کے عین مطابق آزادی سے پہلے ہی متحدہ ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔عقیل احمد اس حوالے سے اپنی کتاب "اردو ناول اور تقسیم ہند" میں فرماتے ہیں:

''ہندوستان کی تقسیم محض اتفاقیہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے مختلف عناصر کارفرما تھے جن

میں انگریزوں کی (پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو) دوقومی منطق اور اسکے اقتصاد وفکری عناصر بہت اہم ہیں۔''[1]

ہندوستان کا بٹوارہ "دوقومی نظریہ" کی بنیاد پر ہوا۔لیکن انگریزوں نے اس پالیسی کے علاوہ بھی یہاں کی مقامی سطح پر اپنے مکروفریب کے جال بچھائے ہوئے تھے ورنہ خالص یہ پالیسی یہاں کے مقامی لوگوں میں نفرت کے بھیج بونے کے لئے ناکافی تھی، کیونکہ اس پالیسی کے فوری نتائج وعواقب سے مذکورہ بات اظہر من الشّمس ہوجاتی ہے۔جس کے دوررس نتائج کے تحت ہندوؤں اور سکھوں کے لئے ہندوستان چنا گیا اور مسلمانوں کے لئے پاکستان۔دونوں اطراف سے لوگوں نے ظلم وجبر کی تاریخ رقم کی۔کل تک جوایک ہی بستر پر سوتے تھے ایک ہی گھر میں رہتے تھے پیار ومحبت کے گیت گاتے تھے آج وہ منافرت کی آگ میں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کی ماں ،بیوی کی عزت لوٹ رہے تھے۔دونوں مذاہب کے لوگوں کے لئے جب الگ الگ خطۂ ارض طے پائے تو دونوں اطراف سے شیطانی خصلت لوگوں نے اقلیت کوتاریخ کے بدترین مظالم کا نشانہ بنایا۔انگریزوں کی 'پھوٹ ڈالو حکومت کرو' والی پالیسی دونوں خطۂ ارض کے لوگوں کے لئے اتنی مؤثر ثابت ہوچکی تھی کہ مظلوموں کو مظلوموں پر نیزے اور ننگی تلواریں چلانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہورہی تھی۔سامراج کے کارندے ساحل پر اس خونین سمندر کے بہاو کا مزاہ لے رہے تھے وہ اپنے محلوں میں اپنی ذہانت کی دہائیاں دے رہے تھے اور دوسری طرف پورا برصغیر ایک اکھاڑا بنا ہوا تھا۔اس اکھاڑے کی منفرد بات یہ تھی کہ اس اکھاڑے میں کوئی روایتی کھیل نہیں کھیلا جارہا تھا بلکہ اس اکھاڑے میں تاریخ کا سب سے بے شرم اور بزدلانا کھیل کھیلا جارہا تھا، ماؤں کے آستینوں سے اس اکھاڑے کو زینت بخشی جارہی تھی۔جوانوں کے تازہ تازہ خون سے اس کے فرش کو سجایا جا رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے کاٹے ہوئے سروں سے اس کے دیواروں کو مضبوط بنایا جا رہا تھا ۔ارض وسماء نے شاید ایسے خونین اور بے شرم کھیل کا پہلی مرتبہ مشاہدہ کیا ہوگا۔ان حالات وواقعات کا جب ایک مخلص قاری مطالعہ کرتا ہے تو پڑھتے ہی اس کی روح کانپ جاتی ہے۔ایک طرف ان فسادات میں لاکھوں نہتے انسانوں کو از جان کیا گیا،معصوم بچوں کو آگ کے شعلوں کی نذر کیا گیا۔رشتہ داروں کے سامنے بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت تارتار کی گئی اور دوسری طرف ہندوؤں نے مسلمان اقلیتی علاقوں کا نقشہ

تبدیل کر کے جان و مال کا صفایا کیا۔اسی طریقے سے مسلمانوں نے ہندو اقلیتی علاقوں کے لوگوں پر قبضہ جما کر ان کی کوٹھیوں کو اپنے نام کروا لیا(آنگن ۳۱۸)۔نہ جانے زمین و آسمان نے اتنی تاب کہاں سے لائی جو یہ عورتوں کی اجتماعی عصمت دری پر بھی ڈٹے رہے۔نہ جانے ان دل سوز واقعات سے زمین پھٹ کیوں نہ گئی اور آسمان نے نہ جانے خون کے آنسوں کیوں نہ روئے؟

غرض دونوں اطراف کے لوگ آپس میں قتل و غارتگری کچھ اس طرح سے کر رہے تھے کہ کسی کو یہ بھی پتہ تک نہ تھا کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ دراصل یہ سب انگریزوں کی لکھی ہوئی جانبدار تاریخ کا نتیجہ تھا جس میں انہوں نے مسلمانوں کو ظالم و جابر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔تقسیم کا ثمرہ یہ بھی تھا کہ فن کاروں کو مختلف طریقوں سے ان بدترین حالات کو جھیلنا پڑا اور سارے فن کار جو کبھی ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع تھے درہم برہم ہو گئے۔ڈاکٹر خالد اشرف اس تناظر میں رقمطراز ہیں:۔

> ''آگ و خون کے اس سمندر میں گزرنے والوں کی اکثریت اردو داں طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والے اور وہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان آنے والے دونوں فرقوں کی مادری زبان اردو ہی تھی۔مہاجرین کے یہ دونوں فرقے بیک وقت ظالم بھی تھے اور مظلوم بھی۔ایسے حالات میں اردو ادب میں فسادات اور ہجرت سے متعلق مسائل کا ذکر کرنا لازم تھا۔اس پُرآشوب دور میں اردو کے مسلم و غیر مسلم ادباء نے متحد ہو کر انسانوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے تنگ نظری وتعصّبات سے بلند اُٹھ کر اپنے قلم سے نیم جان وسسکتی ہوئی خلق کو دوبارہ صحتمند اور پُرامن زندگی گزارنے کی طرف راغب کیا۔'' [۲]

تقسیم کے عوامل و محرکات،پسِ منظر اور پیشِ منظر کو اس دور کے مختلف اصنافِ ادب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور فنکاروں نے انجام دیا۔شاعروں نے اس دور کے حالات کو شعری تجربات میں بہ حسن و خوبی برتا ہے۔اسی طریقے سے نثر نگاروں کی کثیر تعداد نے ان حالات کو ناولوں کے پسِ منظر اور پیشِ منظر میں جس حسن و خوبی سے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ادیبوں اور فن کاروں نے ان حالات کو خود جھیلا اور برداشت کیا اس لیے ان کے فن پاروں میں یہ المیہ پورے درد و کرب کو سمیٹتا ہوا نظر آتا ہے۔اس حوالے سے اردو ادب میں ناول نگاروں کی ایک لمبی فہرست ترتیب دی جاسکتی ہے جنہوں نے ان حالات

و واقعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ناول نگاروں کی اس صف میں جہاں بہت سارے نام گنوائے جا سکتے ہیں جن میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین ،کرشن چندر، رامانند ساگر، حیات اللہ انصاری وغیرہ قابل ذکر ہیں لیکن خدیجہ مستور کے ناول پڑھتے ہی تقسیم، ہجرت، فسادات اور اس دور کے معاشرے کے حوالے سے بے مثال نمونے نظر آتے ہیں۔ان کے نوکِ قلم نے اس سلگتے ہوئے موضوع پر دو اہم ناول[" آنگن "ور " زمین "]صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیئے۔ یوں تو تقسیم اور فسادات کے تعلق سے اردو ادب میں بہت سارے ناول نگاروں کے نام لیے جا سکتے ہیں ان ناولوں میں مصنفہ نے انانیت کو طاق میں رکھتے ہوئے غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔اسی وجہ سے ان ناولوں میں نہ صرف اس دور کی تاریخ مل جاتی ہے بلکہ اس دور کا جیتا جاگتا معاشرہ بھی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔حقائق سے لطیف ایسے معرکے بھی مل جاتے ہیں جس سے اس دور کے لوگوں کے آلام ومصائب کے نقش ونگار سے آگہی مل جاتی ہے۔اس دور کے لوگوں کو جس المیہ سے سابقہ تھا اس کا درد و کرب تو دیکھنے کو ملتا ہی ہے ساتھ ساتھ اس المیہ نے کیسے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا اس کے نمونے بھی جا بجا مل جاتے ہیں ۔موصوفہ نے اپنے دور کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی تحریکوں کا باریک بنی سے جائزہ لیا تھا تب جا کے وہ اردو ادب کو دو شاہکار ناول دے پائیں ورنہ جو کام انہوں نے انجام دیا ہے تلوار کی دھار کے اوپر چلنے کے برابر ہے جس کے دونوں اطراف گہری کھائی ہے۔لیکن انہوں نے فن کارانہ مہارت اور چابکدستی سے اس چیز کو'لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے' محاورے کے مترادف نبھایا ہے۔ان کا آدم جی ایوارڈ یافتہ ناول ''آنگن ''۱۹۶۲ء میں شائع ہوا جس کا مرکزی موضوع جد وجہدِ آزادی اور ہند و پاک کی تقسیم ہے۔موصوفہ نے علامتی انداز میں تقسیم کے المیہ کو آنگن کے روپ میں اُتارا ہے اور اردو ادب میں اپنی صلاحیتوں سے قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔موصوفہ کا دوسرا ناول 'زمین' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے جس کا موضوع ہجرت اور قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات ہیں۔

خدیجہ مستور کے یہ دونوں ناول ۱۹۴۷ء کے تقسیم کے المیے کے اردگرد گھومتے ہیں۔تقسیم سے پہلے اگرچہ مسلم لیگ اور کانگریس والے دو مختلف علموں کے سائے تلے آزادی کی جد و جہد کر رہے تھے اور اس سلسلے میں بہت سارے مسلمان، کانگریس میں بھی شامل ہو رہے تھے لیکن تقسیم کے موقعے پر یکساں طور پر

ہندوؤں اور مسلمانوں کو بگتنا پڑا۔ دونوں گروہوں کے لوگ جو تقسیم سے پہلے باہمی تعاون میں رہتے تھے، تقسیم کے بعد آپس میں قتل و غارتگری میں مشغول نظر آرہے تھے۔ دونوں اطرف سے ظلم و بربریت کا شعلہ بھڑک اُٹھا، ہزاروں کی تعداد میں بچے، بوڑھے، جوان موت کی نیند سُلا دیئے گئے۔ لاکھوں کی تعداد میں ماؤں، بہنوں کی عصمت دری کی گئی۔ لوگ ننگی تلواریں لئے ہوئے جوانوں کا گرم گرم خون پانی کی طرح بہارہے تھے۔ سامان لوٹ لیا جارہا تھا، مال مویشی چھین لئے جارہے تھے، نہتے قافلوں پر وار کئے جا رہے تھے، ماؤں کے سامنے بیٹوں کو ذبح کیا جارہا تھا۔ ایک طرف ہندو اس خونی کھیل سے مسلمانوں سے برسہابرس کا بدلہ لے رہے تھے دوسری طرف مسلمان بھی اپنی دفع میں ہندوؤں پر وار کررہے تھے۔ فن کار نے مذکورہ ناول میں اسی دردوکرب کو بڑے ہی احسن اور سادہ اسلوب میں سمویا ہے۔

خدیجہ مستور نے اپنا ادبی سفر ۱۹۴۰ء کے آس پاس شروع کیا۔ وہ متواتر طور پر منفرد اور معیاری فن پارے تخلیق کرتی رہیں جس کی وجہ سے انہوں نے بہت کم وقت میں نمایاں فکشن نگاروں میں اپنا نام درج کیا۔ ان کا ناول ’آنگن‘ پہلی بار مکتبہ کتاب نما، لاہور نے جون ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ افسانوں کے بہت مدت بعد ان کا یہ ناول زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا جب تک کہ انہیں زبان و بیان پر کافی عبور حاصل ہو چکا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا یہ ناول ایک مکمل ناول کے طور پر منصۂ شہود پر نمایاں ہوا اور ہر کسی سے دادو تحسین وصول کرنے میں کامیاب رہا۔

ناول ’’آنگن‘‘ خدیجہ مستور اور اردو ادب کا ایک شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول ہجرت اور تقسیم کے موضوع پر سچ میں ایک غیر جانبدارانہ فن پارہ ہے۔ یہ ناول کی تاریخ میں اسی لئے زندہ رہے گا کہ ایک خاص عہد کا برصغیر اس کی بدولت زندہ ہے اور اب تک اس لئے زندہ ہے کیونکہ ناول نگار نے اس کا پوری طرح مشاہدہ کیا ہے، اس کے گوشے گوشے میں جھانک کر اس کی ہر چھپی ہوئی چیز کو باہر نکالا ہے اور اس کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر کر مزاج کی نزاکتوں میں دخل حاصل کیا ہے اور یوں پوری طرح اس کا ہمدم و ہمراز بن کر اس کے بھید کھولے ہیں۔ متحدہ معاشرے کے جسم و جان میں دوڑتے ہوئے خون کی روانی مصنف نے اس کی نسوں میں چھپ کر دیکھی اور اس کی دل کی دھڑکنیں سینے میں سما کرسنی ہیں۔ ایک مخصوص دور کا انتخاب، اس موضوع میں پوری طرح جذب ہوکر گہری نظر سے اس کے ہر پہلو کا مشاہدہ اور پورے

انہماک کے ساتھ اس کی ایسی مصوری کی ہے کہ ہر خط وخال نمایاں ہوکر سامنے آجائے۔''آنگن'' کا دیا ہوا یہ سبق اردو ناول نگاری کی روایت کا ایک اہم جزو بن گیا۔اس ناول نے جہاں خدیجہ مستور کو اردو ادب میں ایک خاص مقام عطا کیا وہیں اس ناول نے اردو کے چند بڑے ناولوں میں اپنا نام درج کر کے اس کو حیاتِ جاوید بھی عطا کی ہے۔مصنفہ نے ایک ''آنگن'' کے اردگرد اس دور کے برصغیر کے تمام آنگنوں کی نمائندگی کی ہے۔ڈاکٹر اسلم آزاد اس تناظر میں لکھتے ہیں:۔

> "خدیجہ مستور کا ناول " آنگن "ایک متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کے آنگن کے مسائل کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔لیکن گھر کی چہار دیواری میں محدود یہ آنگن برصغیر کے ہر گھر کا آنگن بن گیا ہے۔ جہاں گھریلو مسائل بھی ہیں اور گھر سے باہر کے مسائل کی آہٹیں،ان کے اثرت اور نتائج بھی۔باہر کے واقعات کی صاف گونج آنگن میں سنائی دیتی ہے۔آنگن سے ملی بیٹھک میں مذہبیات،سیاسیات،ادبیات،تعلیمی مسائل اور دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے،بحثیں ہوتی ہیں اور یہاں کی آوازیں آنگن میں بھی پہنچتی ہیں"۔ [۳]

تحریکِ آزادی اور تقسیم کے المیے کو اگرچہ اس سے پہلے بھی بہت سارے ناول نگاروں نے موضوع بنایا تھا لیکن خدیجہ مستور نے اس سنگین مسئلے کو جس حسن وکمال کے ساتھ برتا ہے اس کا سارا حصہ خدیجہ مستور کے کھاتے ہی میں جاتا ہے۔اکثر یہی ہوتا ہے کہ قومیت اور مذہبیت پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے جو انسان کے نظریہ حیات کو محدود کر کے رکھ دیتا ہے لیکن خدیجہ مستور کے معاملے میں ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔وہ نہ تو مذہب کو اور نہ ہی قومیت کو حقیقت بیانی میں صدِ راہ بننے دیتی ہے۔بڑی ہی فنکارانہ چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ناول " آنگن " جس کا آغاز تحریکِ آزادی کی جدو جہد سے شروع ہوتا ہے اور تقسیمِ ہند پر ختم ہوتا ہے۔فن کار نے جس طرح مسلم لیگ کا ذکر غیر جانبداری سے کیا ہے اسی انداز سے کانگریس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

مسلم لیگ کے حامیوں میں اگرچہ چھمی اور جمیل کو پیش کیا ہے اسی طریقے سے کانگریس کے حامیوں میں جمیل کے والد (بڑے چچا) کو لایا ہے۔مظہر چچا (عالیہ کا باپ) تحریکِ آزادی کا وہ سپوت

ہے جو کہ مجبوراً انگریزوں کی نوکری کرتا تھا لیکن مسلسل ظلم سہتے سہتے ایک دن ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور شدید غم و غصّے کی حالت میں ایک انگریز آفسر کا کام تمام کرتا ہے جس کی وجہ سے ان کو ہمیشہ کے لئے پابندِ سلاسل کر دیا جاتا ہے۔ دراصل ناول " آنگن " میں خدیجہ مستور نے تقسیم سے پہلے اور جدوجہدِ آزادی کی دو الگ الگ تصویریں ہمارے سامنے لائی ہیں جس میں انہوں نے زیادہ زور، اقدار کی شکست و ریخت، بھائی چارہ، متحدہ تہذیبوں کے بکھراو پر دیا ہے۔ جدوجہدِ آزادی کے وقت آزادی کا حصول جتنا خوش کن لگ رہا تھا وہ اتنا تلخ اور جان سوز ہوگا اس کا کسی روح نے کبھی سوچا نہ تھا اور نہ ایسا خیال تک کسی ذہن میں آیا تھا۔ صدیوں سے رہ رہی ایک متحدہ قوم کبھی ایسے بھی بکھر سکتی ہے ایسا کسی دماغ میں شاید تصور تک نہ آیا ہوگا۔ تقسیم کا المیہ ہند و پاک کے لوگوں کا اک ایسا المیہ ہے جس نے جیتے جی لوگوں کو ہلقان کر دیا۔ اس درد کو سہنے والی دونوں قومیں اگر چہ انگریزوں کے مظالم سے چھٹکارا پا گئیں تھیں لیکن دونوں قومیں ایک دوسرے پر جو ظلم کر رہیں تھیں اس کا نظارا شاید زمین نے اس سے پہلے پیش کیا تھا نہ آسمان نے دیکھنے کی جرأت کی تھی۔ کل تک جو مسلم مرد ہندو عورتوں کے محافظ ہوا کرتے تھے، آج وہیں مردان کی عصمت تار تار کر رہے تھے اور کل تک جن ہندو مردوں کی موجودگی میں مسلم عورتوں پر کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا آج انہیں مردوں نے درندوں کی شکل اختیار کی ہوئی تھی۔ شاہینہ اختر نے اپنی کتاب تقسیمِ ہند اورناول ' کرماں والی 'میں ان بہیمانہ حالات کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

> "ان فسادات میں زیادہ تر بے گناہوں کا قتلِ عام اور عورتوں کا استحصال کیا گیا تھا۔ عورتوں کے ننگے جلوس نکالے گئے تھے، ان کی اجتماعی عصمت دری کی گئی تھی، انہیں اجتماعی خودکشی پر مجبور کیا گیا تھا اور ہجرت کے دوران بھی ان کی پامالی کی گئی تھی۔" [۲]

ایک مدت سے آزادی کی جنگ لڑنے کے بعد بالآخر برصغیر نے انگریزوں کے پنجوں سے ۲۰۰ سال بعد ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کر ہی لی۔ آزادی اگر چہ اپنے ساتھ خوشیوں اور شادمانیوں کی بہاریں ساتھ لاتی ہے اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی کرن کی مثل ہوتی ہے مگر ہندوستان کی آزادی میں ایسا کچھ دیکھنے کو نہیں ملا، بلکہ جونہی انگریزوں سے چھٹکارا حاصل ہوا تو دوسری طرف فرقہ وارانہ فسادات نے ایسے سر نکالا کہ انسانیت ۲۰۰ سال تک رہ رہے محکوموں کا یہ خونین منظر دیکھ کر شرمسار ہوئی۔ اس عرصہ میں بر

صغیر میں جو تباہی و بربادی ہوئی اُس کی مثال دنیاوی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی ۔اس خونین منظر پے جہاں ایک طرف کانگریس کے امراء تذبذب کے شکار تھے دوسری طرف مسلم لیگ کے کاری کردہ بھی کوئی واضح فیصلہ لینے سے قاصر ہی رہے۔انگریزوں کے بچھائے ہوئے جال نے دونوں فریقوں کو غلامی میں اتنا ڈبویا ہوا تھا کہ کوئی بھی فریق انگریزوں کی غلامی سے پہلے کے متحدہ ماضی کو یاد کر نہ سکا جہاں یہ دونوں قومیں ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے۔ابوالکلام آزاد اپنی کتاب "india wins freedom" میں تقسیم کے اس المیے کو کچھ اسطرح بیان کرتے ہیں:۔

> "The country was free, but before the people could fully enjoyed the sense of liberation and victory, they wokeup to find that a great tragedy had accompanied freedom. We also realised that we would have to face a long and difficult journey before we could relex and enjoy the from the roots of journy.(5)
>
> (یعنی ملک آزاد ہوگیا لیکن اس سے پہلے کہ لوگ آزادی اور کامیابی کا لطف لیتے آزادی کے دوسری طرف تقسیم کے المیے نے سر اُٹھا رکھا ہوا تھا۔اسی وقت ہم نے اس چیز کو جان لیا کہ ہم کو اپنے سفر کے پھل کھانے کے لیے بہت انتظار کے ساتھ ساتھ بہت سارے مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا)۔ ۵

تقسیم کے اس دل دہلا دینے والے اور منحوس واقع کو خدیجہ مستور نے استعاراتی انداز میں جس درد اور حقیقت بیانی سے سمویا ہے وہ خدیجہ مستور کا ہی حصہ ہے۔ناول کے ہر حادثے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور کا انسان تہذیب اور انسانیت کے راستے سے کتنا بھٹک گیا تھا اور اشرف المخلوقات کے درجے سے متصف یہ انسان کتنا شیطان صفت ہو گیا تھا اس کا شاہد اس دور کا ہر ہر آلہ ہے۔ناول کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ تقسیم کے المیہ نے انسانیت کا خاتمہ کر کے انسانوں کو وحشی نما بنا دیا تھا۔انسان،انسان کم اور حیوان نما زیادہ ہو گئے تھے۔ ہندو مسلم بھیانک فرقہ وارانہ فساد کے درمیان ملک کا بٹوارہ ہوگیا اور پاکستان بن

گیا۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی گئی، خون کے پیاسے لوگوں نے ہر گام وشہر کا محاصرہ کر کے اپنی خون کی پیاس بجھائی۔ زندہ رہنے کے لیے ہر کسی کو جان کے لالے پڑ گئے۔ مسلم لیگی بھاگتے بھاگتے حدِ متارکہ کے پار ہوئے اور خوف والم کے اسی ماحول میں عالیہ بھی اپنے ماں، ماموں اور انگریز بھابی کے ساتھ لاہور چلی گئی۔

فن کارہ نے بڑی ہی فنی چابکدستی سے اس دور کے ایک آنگن کے ذریعے سے اس وقت کے بر صغیر کے تمام آنگنوں کا نقشہ ہمارے سامنے لایا ہے۔ یہ ایک طرف جہاں اس کے وسیع مطالعہ اور گہری سوچ کا عندیہ دیتا ہے وہیں اس سے یہ بھی اظہر من الشّمس عیاں ہو جاتا ہے کہ فنکار کو ناول کے فن سے کتنی گہری واقفیت اور مناسبت ہے۔ ''آنگن'' کے فن سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ فنکارہ اس فن کی تمام پیچیدگیوں اور الجھنوں سے اچھی طرح واقف ہے ورنہ ان موضوعات سے پُر فن پاروں میں عام طور پر فنکار جذبات کے بہاو میں حقائق کو پیش نہیں کر پاتے اور اکثر فنی تقاضوں سے بھی گریز کرتے ہیں لیکن اس ناول میں خدیجہ مستور نے ایک تو ناول کے تمام تر فنی تقاضوں کو بہ حسن وخوبی برتا ہے اور اک قاری کی دلچسپی کے لئے ایسے پیکر تراشے ہیں کہ فکشن کے فن سے واقف قاری آخر تک ناول کے فن میں مدہوش اور سرشار اسی میں ڈبکیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''معین الدین جینا پڑے'' اپنے ایک مضمون میں ناول آنگن کی فنی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "دراصل خدیجہ مستور نے آنگن میں تضاد کی تکنیک کے سہارے سیرتوں کو اُجاگر کرنے کی خاطر عالیہ کے ساتھ چھمی کو نتھی کیا ہے کہ رنگ ہلکے اور سنجیدہ ہوں یا شوخ اور بھڑک دار، ساتھ ہوتے ہیں تو دونوں کھلتے ہیں اور الگ الگ ہوں تو دونوں ماند پڑ جاتے ہیں۔ آخری انتخاب اور فیصلہ تو ذوقِ نظر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ تکنیک کی سطح پر راوی کو عالیہ کا دم ساز بنا کر خدیجہ مستور نے یہ جتن بھی کیا ہے کہ اگر قاری کو فکشن کی تھوڑی بہت سمجھ ہے تو اس کی نظر رسوا نہ ہو۔
>
> ''چھپا کر نظر میں لانا اور دکھا کر چھپانا فنکار کا کمال ہے۔ خدیجہ مستور نے عالیہ پر چھمی کی چادر ڈال دی ہے۔ اس شوخ چادر سے چھنتی ہوئی عالیہ کی عظمت اہلِ نظر سے داد لیے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔۔ کچھ نظریں چادر ہی کو چوم کر لوٹ آئیں تو اور بات ہے"۔ [6]

خدیجہ مستور کا فن حقیقی زندگی سے مستعار ہے۔اس میں ان کی شخصیت اور ماحول کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ان کے دونوں ناول ان کے گہرے فنی شعور کا اور گہرے مشاہدے کا قدم قدم پر عندیہ دیتے ہیں۔انہوں نے زندگی کے حقائق کو صرف رسمی طور پر ہی نہیں بلکہ گہری بصیرت اور خداداد تخلیقی قوت کی بنیاد پر غیر معمولی طریقے سے وسعت اور بلندی عطا کی ہے۔ناول " آنگن " میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کی جستجو ایک ذہین قاری کسی ناول میں کرسکتا ہے۔اس کا پلاٹ فنی اصولوں کے عین مطابق بے حد مربوط اور جامع ترتیب دیا گیا ہے جیسا کہ ناول کی کہانی ہوتی ہی زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم منسلک اور مربوط۔ناول کے واقعات آپس میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں، ہر واقع پڑھتے پڑھتے اس دور کے حالات کی سچی تصویر آنکھوں کے سامنے پھیر جاتی ہے۔

ناول کے فنی کمال میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگر ناول میں سے ایک چھوٹا سا بھی واقع نکال دیا جائے گا تو پوری کہانی ایک خلاء اور خلیج کا شکار ہوکر رہ جائے گی ،لیکن خدیجہ مستور اپنے ناولوں میں ہر کوئی واقع تسلسل کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ڈاکٹر اسلم آزاد اس حوالے سے اپنی کتاب "اردو ناول آزادی کے بعد" میں رقمطراز ہیں:۔

> "شروع سے اخیر تک ناول کا قصہ واقعات کے ایک مضبوط تسلسل پر قائم ہے۔کوئی واقع فضول اور غیر فضول اور غیر ضروری نہیں ہے۔اس کا ہر واقعہ ناول کی دلچسپی کے عنصر میں اضافے کا سبب ہے۔واقعات سطحی ،سپاٹ اور کھردرے نہیں ہیں۔منظّم،مضبوط،خوبصورت اور تراشے ہوئے ہیں۔ہر واقعہ ناول کردار یا ماحول کی نفسیات کی وضاحت کرتا ہے"۔[7]

جب ہم ناول ''آنگن'' کی کردار نگاری کی بات کرتے ہیں تو ہم ناول کی کردار نگاری کو مکمل،مؤثر اور نہایت ہی متوازن پاتے ہیں۔ناول کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ناول ''آنگن'' بہت سارے کرداروں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر کوئی کردار تقسیم کے المیے کے ساتھ کسی نہ کسی طریقے سے جڑا ہوا ہے ۔اہمیت اور حیثیت کے اعتبار سے ناول کا ہر کوئی کردار فعال اور کارآمد ہے کوئی بھی کردار فضول نہیں ہے۔ناول کے کچھ کردار شروع سے آخر تک ایک جیسے رہتے ہیں اور کچھ وقت کی تیز رفتاری کے

ساتھ ساتھ اپنے آپ میں تبدیلیاں لاتے ہیں۔جن میں چھمی کا کردار مثال کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔اس ناول کی کردار نگاری کی انفرادیت میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ناول کے نسوانی کردار مردانہ کرداروں کے مقابلے میں بے حد فعال نظر آتے ہیں۔مردانہ کرداروں میں بڑے چچا،جمیل،شکیل ،صفدراوراسرارمیاں ناول کے کینوس پر دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی کردار حالات وواقعات کوموڑنے کا قصد نہیں کرتا جس طریقے سے نسوانی کرداروں میں عالیہ اپنے فیصلے سے آخر تک نہیں ہٹتی اور دوسری طرف چھمی کسی بھی طرح ہار نہیں مانتی۔مردانہ کرداروں میں سے کوئی بھی کردار اپنے اندر خاطر خوہ تبدیلی لاکر پرکشش اورآئیڈئل نہیں بن پاتا۔صفدر کا کردار اگرچہ ناول کے شروع میں اپنے مایوس کن لہجے اوراپنے کردار سے اپنی طرف راغب کرتا ہے لیکن ناول کے آخر میں اپنے موقف سے ہٹ کر گویا اپنی پائی ہوئی عزت کھو بیٹھتا ہے۔اسی طریقے سے جمیل کا کردار بھی ہیرو کی حیثیت اختیار نہیں کر پاتا،ان کا کردار ہمارے سامنے معمولی پن کے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔جس کی وجہ سے ناول میں کسی بھی جگہ وہ ہیرو کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے نہیں آپاتے۔ان کا چھمی کے بعد عالیہ پر ڈورے ڈالنا اور ڈانٹ کھانے کے باوجود بھی اپنی روش پے قائم رہنا ان کے کردار کو معمولی بنا دیتا ہے۔ناول کے نسوانی کرداروں میں عالیہ،چھمی اور نجمہ کے کردار بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔عالیہ کا کردار ہیروئن کی حیثیت رکھتا ہے،جواول سے لے کرناول کے اختتام تک اپنے موقف سے نہیں ہٹتی۔چھمی کے کردار میں بے پناہ جاذبیت ہے اس کا کردار اپنی انفرادیت کی وجہ سے نہایت ہی دلچسپ اور دلکش ہے۔ہمارے معاشرے کے اوسط گھرانوں میں ضدی اور بدتمیز لڑکیاں اسی کی طرح ہوتی ہیں۔نجمہ کا کردار بھی اس لحاظ سے اہم ہے کیونکہ اس کا کردار اپنے اندر ایک خاص طبقے کی نمایندگی کرتا ہے۔

فن کار نے ہمیں ایسے کرداروں سے بھی متعارف کرایا ہے جو ایک مخصوص مزاج اور ایک خاص طبعیت کے حامل ہونے کے باوجود مثالی ہیں۔ان کی حرکات وسکنات میں کہیں کہیں ایک ایسی بات آجاتی ہے کہ پڑھنے والے کو ان کے صحیح ہونے میں شبہ ہونے لگتا ہے۔لیکن ان بہت سے مشکوک اور مشتبہ کرداروں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک کردار یوں اپنی واضح شخصیت کی نمائش کرتا ہوا باہر نکلتا ہے کہ دیکھنے والے فوراًاس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔اُسے دیکھتے ہی اس سے قرب حاصل کرنے کی خواہش انہیں بیتاب

کرتی ہے اور یہ خواہش انہیں ہر جگہ اس کردار کے ساتھ لئے پھرتی ہے۔ وہ اس کی ہر بات میں لطف لیتے ہیں اور وہ کردار "عالیہ" کا ہے۔ عالیہ جہاں اس ناول کا پرکشش اور دلفریب کردار ہے وہیں وہ اس ناول کے ذریعے سے تقسیم کے ان کرداروں کی نمائندہ بھی ہے جو اندر رہی اندر تقسیم کے خلاف تھے لیکن حالات نے ان کو بھی مذہب کے بلبوتے پر جبراً ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ منسوب کیا۔ نیلم فرزانہ اپنی کتاب 'اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار' میں عالیہ کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

> ''عالیہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کردار کے اندر بجائے خود موضوع بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی ہے۔ وقت اور حالات کے تمام پیچ وخم پر اس کی گہری نظر ہے۔ جس ماحول میں وہ زندہ ہے اس کے تمام نشیب وفراز سے واقف ہے۔ وہ اپنے پورے خاندانی ماحول سے غیر مطمئن اور بے زار ہے۔ لیکن اس کے اندر بغاوت یا احتجاج کی قوت نہیں ہے۔ وہ اپنے خیالات لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے لیکن اس کا شعور اس سے خاموش رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ کوئی ....وہ ایک تیز اور حساس ذہن کی مالک ضرور ہے لیکن کوئی عملی قدم اٹھانے سے قاصر ہے۔'' [8]

اس خیال کے لوگ اگرچہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مفاہمت چاہتے تھے مگر وہ اس طوفانِ عظیم کو چاہتے ہوئے بھی نہ روک سکے۔ اس طرح کے لوگوں کے لئے حالات سازگار تھے نہ ہی کوئی رہنما ان کے خیالات کی ترجمانی کرنے کے لئے آگے آرہا تھا۔ سارے رہنما اپنے مفادات کے لئے لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات ڈالنے میں مصروفِ عمل تھے۔ لوگوں کو ایسے کھیل کے لئے تیار کیا جارہا تھا جو انہوں نے کبھی کھیلی تھی نہ ان کے آباواجداد نے۔ کھیلنا تو درکنار ان کے کانوں نے اس کھیل کے بارے میں برسوں سے سننا گوارا نہیں کیا تھا لیکن اس کھیل سے آشنا لوگ ان ناآشنا لوگوں کے دلوں میں ایسے ایسے جذبات ڈال رہے تھے کہ ان کے اندر بھی آپسی بغاوت کا رجحان عام ہو گیا۔ بغاوت کے دائیوں نے اس کی ضد میں بات کو ایسے حقائق سے تیار کیا جن کی دلیلیں کبھی صحیح قرار نہ پائی تھیں۔ اس تذبذب کی سی حالت میں بھلا کون سا ذی حس انسان احتجاج کی قوت ہونے کے باوجود بھی متحدہ ہند کو مزید تباہی کے منہ میں دھکیل دیتا، جبکہ سارے لوگ باغی ہو چکے تھے اور کوئی بات سننے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ اس

لئے عالیہ جیسے کرداروں نے حالات کا پورا پورا ادراک ہونے کے باوجود بھی عملی اقدام نہ اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔ ابوالکلام آزاد اپنی کتاب india wins freedom میں اس حوالے سے رہنمائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Congress as well as the Muslim League had accepted partition. Since the Congress represented the entire nation and the Muslim League had considerable support among the Muslims, this would normally have meant that the whole country had accepted partition. The real position was however completely different. When we looked at the country immediately before and after partition, we found that the acceptance was only in a resolution of the All-India Congress Committee of the Congress and on the register of the Muslim League. The people of India had not accepted partition. In fact, their hearts and souls rebelled against the very idea". (9)

(یعنی کانگریس اور مسلم لیگ نے تقسیم کا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ کانگریس پورے ملک کی نمائندہ جماعت تھی اور مسلم لیگ کو بھی کافی حد تک تمام مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا تھا کہ سارے لوگ تقسیم پر رازی ہو گئے۔ لیکن حقیقی صورتحال اس سے قطعی مختلف تھے۔ سرِ دست جب ہم تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد کی صورتحال پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ تقسیم تو خالی آل انڈیا کانگریس کمیٹی

اور مسلم لیگ کے آراکین نے ہی قبول کیا ہے۔ بھارت کے لوگوں نے تقسیم کے فیصلے
کو قبول نہیں کیا تھا۔ بلاشبہہ وہ اس فیصلے کے خلاف تھے)۔[9]

ناول 'آنگن' میں صفدر کا کردار تقسیم کے حوالے سے بہت ہی اہم ہے۔ تقسیم سے پہلے اس کی زندگی بڑی اجیرن بن چکی تھی، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی گھر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ گھر سے نکل کر وہ علی گڑھ پڑھنے کے لئے پہنچ جاتا ہے جہاں وہ کیمونسٹ بن جاتا ہے۔ پھر تقسیم کے بعد جب وہ پاکستان پہنچ جاتا ہے تو اس کا نظریہ بالکل تبدیل ہو چکا ہوتا ہے وہ کیمونسٹ سے سرمایہ دارانہ (Captalist) فکر کا متحمل ہوا ہوتا ہے جس کا انکشاف ناول کے آخر میں اس کے اور عالیہ کے درمیان مکالمہ سے ہوتا ہے (آنگن،۳۵۱)۔ دراصل صفدر کے کردار کے ذریعے سے خدیجہ مستور نے تقسیم کے حوالے سے ہم تک ایک بہت بڑی بات پہنچانی چاہی ہے جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور جس تک ابھی تک بہت کم تنقید نگاروں نے توجہ مرکوز کی ہے۔ صفدر جس کو تقسیم سے پہلے چہاروں طرف سے گھریلو اور سماجی حالات نے گھیرا ہوا تھا، غریبوں اور ناداروں کے لئے اکثر متافکر رہتا تھا۔ سماج اور گھر میں معمولی سی حیثیت تک نہیں ہوتی۔ لیکن تقسیم، ہند اور قیامِ پاکستان ان جیسے لوگوں کے لئے نجات دہندہ کے روپ میں آ گیا، وہ لوگ جو کل تک کھانے کے لئے ترس رہے تھے ان کی آنکھوں نے کروڑ پتی اور عرب پتی بننے کے خواب دیکھنے شروع کئے، ناداری میں جو لوگ احساسِ ہمدردی کے وصف سے متصف تھے آج امیر بننے کی خواہش نے ان کو بیتے ہوئے کل سے قطعی بیگانہ اور لا پرواہ بنا کے چھوڑ دیا۔ ان جیسے لوگوں کے لئے قیامِ پاکستان اسلامی انقلاب بن کے نہیں آیا بلکہ ان کو اس میں خزانوں کی کنجیاں نظر آ رہیں تھیں۔ صفدر جیسے لوگوں کو قیامِ پاکستان سے کوئی ہمدردی نہ تھی ان کو تو اس میں بس اپنے مفادات نظر آ رہے تھے۔ اس جیسے لوگوں نے نئے ملک آ کر اپنی ترقی اور کامیابی کے لیے الگ ہی راہ اختیار کی اور پرانی راہ سے یکسر منہ موڑ لیا۔

عالیہ کے بغیر بہت سارے کردار ایسے ہیں جو آغاز سے انجام تک ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوئے نہ صرف ایک دوسرے کے قدموں، بلکہ اپنے قدموں کی آہٹیں بھی سنتے چلے جاتے ہیں۔ عبدالحق حسرت اپنے مضمون، "آنگن: ایک تنقیدی مطالعہ" میں فرماتے ہیں:۔

''جب ہم اس ناول کے ہر کردار کو تخلیقی قوت کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں ان

میں کچھ نہ کچھ خوبی ضرور نظر آتی ہے۔ ہر کردار کے نقش اس طرح اُبھرتے ہیں کہ وہ ہماری قوتِ تخیل کو متاثر کرتے ہیں اور ہمارے ذہن میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ناول نگاری میں جو نفسیات نگاری کا اہم مقام ہے وہ یہاں ہمیں ملتا ہے۔'' [۱۰]

اس ناول کا سب سے دلچسپ اور پُرکشش کردار چھمی کا ہے۔ یہ عالیہ کے منجھلے چچا کی بیٹی ہے۔ جو بدمزاج، جذباتی اور بے باک طبعیت کی مالک ہے۔ اس میں عالیہ کی طرح نہ ہی سنجیدگی ہے نہ ہی اس جیسی تہ داری۔ وہ عالیہ کی طرح حالات کے بوجھ تلے ڈوب نہیں جاتی بلکہ وہ حالات سے بغاوت کرنے کا حوصلہ بدرجۂ اتم رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر جب جمیل اپنے گھر میں عالیہ کی تشریف آوری دیکھ کر اسی کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور چھمی کو نظر انداز کرتا ہے تو چھمی نہ ہی حالات کے بوجھ تلے دب جاتی ہے نہ ہی احساسِ کمتری کا شکار ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی باغی فطرت وہاں بھی علمِ بغاوت کھڑا کرتی ہے:

''بھئی جو ہم سے محبت کرئے گا ہم اس سے محبت کریں گے یہ تو بدلہ ہے
اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔'' [۱۱]

خدیجہ مستور کے ناول کا اسلوب سادہ اور اندازِ بیان سلیس ہے۔ پورے ناول کی عبارت دلکش اور دلچسپ ہے۔ آغاز سے لے کر انجام تک کوئی بھی ایسا لفظ نہیں ملتا جس کی تفہیم وتشریح مطلوب ہو، روزمرہ زندگی میں جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں انہیں کے سہارے سے فن کار نے قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ جیسے کہ سہل اور سلیس اسلوب کا تقاضہ ہی ہوتا یہی ہے کہ عبارت دلکش اور قاری کے لئے قابلِ سمجھ ہو جس میں بیجا سقم اور مشکل پذیری نہ ہو۔ شہاب ظفر اعظمی نے اپنی کتاب ''اردو ناول کے اسالیب'' میں آئی اے رچرڈز کے حوالے سے روزمرہ کی زبان کو ترسیلی زبان کہنے کی کوشش کی ہے۔ ترسیلی زبان کا احاطہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''یہ نثر کی بہت سادہ اور صاف شکل ہے اس میں الفاظ کی شان وشوکت یا معنی آفرینی پر توجہ نہیں دی جاتی، اس میں عام فہم اور مانوس الفاظ سادہ طریقے ہی پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ سادگی میں برجستگی و بے تکلفی کی جھلکیاں البتہ جابجا نظر آتی ہیں، یہاں خیال کی بلندی اور فکر کی گہرائی اس حد تک نہیں ہوتی جو بات کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دے، سادگی اور بے تکلفی اس کا وصف ہے اور ابلاغ کا معنی پیشِ نظر رہتا ہے

اس لئے ایسی تحریریں جو کسی فوری مقصد کو سامنے رکھ کر تخلیق کی جاتی ہیں وہ بھی مشترک نثر کے ذیل میں آتی ہیں''۔ [۱۲]

خدیجہ مستور نے بھی اپنی ناولوں میں من وعن یہی اسلوبیاتی طریقہ اختیار کرکے اردو کے مادودِ چند ناول نگاروں میں اپنا نام درج کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ناول ''آنگن'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بے پناہ سادگی اور عمومیت کا انداز لئے ہوئے ہے۔معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی آسانی سے اس ناول کے نفسِ مضمون تک رسائی پانے کا متحمل ہے۔اس ناول میں کہی پر بھی ذہن کو اُچک لے جانے والے الفاظ نہیں ملتے اس وجہ سے ایک قاری ناول میں غوطہ زن ہو کے اپنی کام کی چیزیں نکال لاتا ہے اور مزے لے لے کر کسی اُکتاہٹ کے بغیر ناول اختتام کو پہنچتا ہے۔موصوفہ نے سیدھی سادی باتوں اور روزمرہ حالات و واقعات سے ناول کا تانا بانا بُنا ہے جس کی وجہ سے ہر کوئی قاری اس کو اپنی زندگی سے قریب تر محسوس کرتا ہے اور اسی میں اپنے بنیادی مسائل ومصائب کا مداوا پا لیتا ہے۔ناول کو پڑھتے ہوئے ہمیں کہیں پر بھی قرۃ العین حیدر کے نقش و نگار نہیں ملتے ، چہ جائے کہ دونوں نے شعور کی رو کی تکنیک کو برتا ہے۔لیکن قرۃ العین حیدر کے ہاں خرابی یہ ہے کہ اس کے ہاں ہمیں دلچسپی کا پہلو ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے جبکہ خدیجہ مستور کے فن میں ایک قاری کو پتہ ہی نہیں چلتا ہے کہ شعور کی رو تکنیک کا استعمال عمل میں لایا جا رہا ہے یا نہیں۔قرۃ العین حیدر کے اکثر ناول معنی آفرینی کی وجہ سے ایک قاری کی سمجھ سے پرے ہی رہتے ہیں،شوکتِ الفاظ کا بے جا استعمال کرکے وہ اکثر قاری کو شش و پنج میں ڈال دیتی ہے۔لیکن خدیجہ مستور نے شان و شوکت یا معنی آفرینی سے پرہیز کیا ہے بلکہ عام فہم اور مانوس الفاظ سادہ طریقے ہی سے استعمال کئے ہیں۔البتہ اس کے فن میں سادگی میں برجستگی و بے تکلفی کی جھلکیاں جابجا نظر آتی ہیں۔اس کے ہاں فکر کی گہرائی اور خیال کی بلندی اس حد تک نہیں ہے جو بات کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیتا ہے بلکہ سادگی اور بے تکلفی ہی اس کا وصف ہے۔موصوفہ نے ناول کے بیانیہ میں انفرادی تجربے سے زیادہ اجتماعی تجربے پر زور مرکوز کیا ہے اور جذبات کے بجائے خارجی حقیقتوں کو نظروں کے سامنے رکھا ہے۔ ناول " آنگن " کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے شہاب ظفر اعظمی اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:۔

''آنگن "ایک ایسا ناول ہے جو بے پناہ سادگی اور عمومیت لئے ہوئے ہے۔ناول

نگار کو جس شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ خدیجہ کے یہاں موجود ہے۔ انہوں نے ناول کا تانا بانا سیدھی سادی باتوں اور روزمرہ کے واقعات سے تیار کیا ہے۔ یہ ناول قاری کو اپنی زندگی سے بہت قریب محسوس ہوتا ہے، اسے اپنے بنیادی مسائل کا احساس دلاتا ہے اور یہ محسوس ہونے نہیں دیتا کہ وہ کسی اجنبی دنیا میں سفر کر رہا ہے۔ مصنفہ نے ناول میں جو تصویریں پیش کی ہیں اُن کی حد سے زیادہ دلکشی اس امر میں ہے کہ وہ حد سے زیادہ نارمل ہیں۔'' [۱۳]

ناول ''آنگن'' مکالمہ نگاری کے لحاظ سے بھی ایک کامیاب ناول ہے۔ فن کار نے زیادہ اس ناول میں روائتی بیانیہ انداز ہی اپنایا ہے اور کہیں کہیں پر فنِ مکالمہ نگاری کو بھی جگہ دی ہے۔ اکثر مکالمے برجستہ مختصر اور چست ہیں۔ ناول کا حسن بڑھانے کے لئے فنکار نے کہیں کہیں پر ادھورے جملوں کا سہارا لیا ہے۔ فن کار نے عین کرداروں کے مطابق مکالمے کروائے ہیں جس سے ہر کسی کردار کی نفسیاتی کیفیت ہم پر عیاں ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عالیہ کی بہن کسم دیدی کا خاوند جب اپنے وطن کی آزادی کے لئے قربان ہو جاتا ہے تو کسم دیدی اپنی ماں سے یوں مخاطب ہوتی ہے:

''انہیں اگر مجھ سے محبت ہوتی تو کبھی نہ جاتے۔ انہیں تو صرف اپنے دیش سے محبت تھی۔'' [۱۴]

مکالمہ کرواتے وقت فنکار نے کرداروں کی ذہنی کیفیت وحیثیت کا احسن طریقے سے خیال رکھا ہے۔ ہر کوئی مکالمہ کرداروں کی شخصیت، عمر اور ماحول کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر مسز ہاروڑ جب اردو بولتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ واقعی کوئی انگریز خاتون ہی بول رہی ہے۔ جس سے یہ صاف جھلکتا ہے کہ ناول کے مکالمے انتہائی فطری اور موقع ومحل کے اعتبار سے پرُ ہیں۔ مثال کے لیے مسز ہاروڑ کا یہ مکالمہ پیش کیا جاسکتا ہے:۔

"ہم آپ لوگوں سے مل کر بہت کھوش ہوا ہے"
''تم ہمارے پاس بیٹھنا مانگتا عالیہ"۔ [۱۵]

مکالمہ چونکہ ناول نگار کے ہاتھ میں اظہارِ خیال کا بہترین آلہ ہوتا ہے جس کا موصوفہ نے بر پور

فائدہ اُٹھایا ہے۔مصنف نے اپنے کرداروں کی زبانوں سے جو کچھ چاہا ہے، جو کچھ ضروری سمجھا ہے اور جن امور کو اہم جانا ہے ادا کروایا ہے۔انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ایک خاص مقصد اور ایک خاص نظریئے کی تعلیم وتبلیغ کے لئے لکھا ہے۔موصوفہ کو جو بات معمولی سے خاص بناتی ہے وہ ان کا اندازِ تعلیم وتبلیغ ہے وہ پورے ناول میں ایک جگہ بھی اپنے نظریئے کی تبلیغ کرتی نظر نہیں آتی کیونکہ فن کار کا اپنے فن پارے میں مقصد کو واضح کر دینا اس کو معمولی بناتا ہے اور فن پارہ محض تبلیغ اور پروپگنڈا ہو کر رہ جاتا ہے۔وہ مدہم اور پرکشش مکالموں سے ایک قاری کو خود ہی مقصدِ ناول پر اُبھارتا ہے وہ خواہ مخواہ ناصح، مصلح اور راوی بن کر اپنی رائے ہمارے اوپر وارد نہیں کرتی بلکہ ناظر کو بہت آہستہ آہستہ باتوں میں لگا کر اپنے راستے پر لے آتی ہے اور غیر محسوس طریقے سے اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔بڑے چچا اور سلیم کے اکثر مکالمے اس دور کے بیشتر گھرانوں کی خوب عکاسی کرتے ہیں کہ کیسے اس دور کا ہر گھر سیاسی نظریات کی وجہ سے آپسی رسہ کشی میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ان دونوں کا مکالمہ ملاحظہ ہو:۔

> ''یہ کانگریسی لیڈر تو جیسے جیل جائے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتے، خالص ہندووں کی جماعت کے لئے اتنی قربانیاں دے کر جانے انہیں کیا مل جائے گا، کس قدر ہندو طبعیت ہے ان صاحب کی بھی، کیسے کیسے ہندو فساد ہوئے مگر ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا"۔۔۔"مسلم لیگ کی کھپت تو انگریز بہادر کے دفتروں میں ہوتی ہے بڑے چچا نے کروٹ بدلے بغیر کہا''۔[١٦]

مصنفہ کا یہی کمال ہے کہ وہ چیزوں کو مدلل اور حقایق کے پردے میں سجا کر زیبِ تن کر کے قارئین کے لیے باعثِ کشش اور قابلِ توجہ بناتی ہے۔ناول کے بیچ بیچ میں تضاد کی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان تناو کی بر پور عکاسی کی ہے اور اس چیز کو مکالمہ کے ذریعے بڑے حسین انداز میں پیش کرنے کی مہارت رکھتی ہے۔ایک جگہ "چھمی" اور "بڑی چچی" کے درمیان ایک غصیلے مکالمے سے یہ بات اظہر منّ الشّمس ہو جاتی ہے کہ اس ناول کا ہر مکالمہ برمحل و برجستہ ہے:۔

بڑی چچی کہتے ہوئے:۔

"ارے اس کے بابا کو ہوش ہی کہاں، جو اس کے دو بول پڑھا کر ٹھکانے لگا دے"۔

تو اس کے جواب میں، چھمی یوں کہتی ہے:۔

''جسے شوق ہو وہ خود اپنے دو بول پڑھوالے"۔ [۱۷]

ناول " آنگن " کو خدیجہ مستور نے ماضی اور حال کے تناظر میں تحریر کیا ہے۔ ماضی کو یادوں کے سہارے فلیش بیک تکنیک میں پرویا ہے، جس میں ناول کے پورے پسِ منظر کو سمولایا ہے۔ کیونکہ وہ اس نکتے پر یقین رکھتی ہیں کہ یادیں ایک پائیدار زندگی کو سمجھنے اور جینے کے لئے بہت زیادہ ضروری ہیں۔اسی طریقے سے حال کو پیشِ منظر کے طور پر فن کار نے اپنے ناول میں جگہ دی ہے۔تا کہ پسِ منظر اور پیشِ منظر میں ایک گہرا ربط پیدا ہو اور قاری بیک وقت پسِ منظر اور پیشِ منظر کو اپنے اذہان میں اتارنے کی کوشش کرے۔موصوفہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ماضی کے بغیر حال کا تعین ایک ناگزیر عمل ہے۔ماضی میں جھانک کر ایک انسان اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے حال میں وہ کوتاہیاں اور غلطیاں نہ دہرانے کا عزم ظاہر کرتا ہے۔ماضی ایک انسان کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے جس کو ایک انسان کھنگال کے اپنے حال لے لئے رہنما نکات ڈھونڈ کر اپنی زندگی کے اصول وضع کرتا ہے۔عالیہ اگر ماضی میں مردوں کی حقیقت سے آشنا نہ ہوتی اور تہمینہ اور کسم دیدی کے حالات اس کی زندگی کا سرمایۂ حیات نہ بن چکے ہوتے تو وہ بھی آسانی سے مردوں کے جھوٹے محبت میں آ جاتی اور اپنی آزادی کو غلامی میں بدل لیتی، یہی ماضی اس کے حال کی تعمیر و ترقی میں کلیدی رول ادا کرتا ہے ورنہ جمیل اور صفدر کی پل بھر کی محبت اس کی زندگی کو کسم دیدی اور تہمینہ کے عاشقوں کی طرح جہنم بناتے ہوئے دیر نہ کرتے۔ڈاکٹر اسلم آزاد اس حوالے سے اپنی کتاب "اردو ناول آزادی کے بعد" میں لکھتے ہیں:۔

> ''آنگن کے ابتدائی حصّے میں فلش بیک کی ٹیکنیک اپنا کر خدیجہ مستور نے یادوں کے سہارے ناول کے قصّے کو آگے بڑھایا ہے۔اس کا احساس ناول نگار کو بھی ہے کہ اگر یادیں نہ ہوں تو زندگی کتنی کٹھور، جاں گسل اور دشوار ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ حال کی محرومیوں اور الجھنوں کا مداوا انسان خوابوں اور یادوں میں ڈھونڈتا ہے اور چند لمحوں کے لئے ہی سہی خود کو فریب دے لیتا ہے۔'' [۱۸]

خدیجہ مستور کے دور تک آتے آتے ناول کا فن بہت سے مد و جزر سے ہو کے گزرا تھا۔اس میں ہئیت

وساخت کے نئے نئے طریقے اپنائے جارہئے تھے، نئے نئے اسالیب اور موضوعات سے ناول کے فن کو تقویت بخشی جارہی تھی۔ کچھ ناول نگار جنسیات کو موضوعِ طبع بنارہے تھے کچھ نے سماجی اصلاح کا بھیڑا اٹھایا ہوا تھا، کچھ تاریخی موضوعات پر لکھ رہے تھے تو کسی نے ظلم و زیادتی کو اپنی ناولوں کا موضوع بنایا ہوا تھا۔عصری مناسبت کی وجہ سے تحریکِ آزادی، تقسیم کے المیے اور تقسیم کے بعد کے حالات کو بھی بہت سارے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں جگہ دی۔لیکن خدیجہ مستور نے اس میدان میں قدم رکھتے ہی یہاں پر بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے اچھوتے معرکے تراشے ہیں۔

فن کار نے جس " آنگن" کو برصغیر کے تمام آنگنوں کا نمائندہ بنایا ہے وہ یوپی سے تعلق رکھنے والا ایک گھر ہے جس میں الگ الگ سیاسی نظریات رکھنے والے لوگ رہتے ہیں جو ہمیشہ سیاسی رسہ کشی میں مبتلا ہوتے ہیں۔اس آنگن میں دن کا سورج بھی سیاسی رسہ کشی سے طلوع ہوتا ہے اور دن کا غروب بھی۔اس گھر کے تمام کردار کسی نہ کسی طرح سے سیاسی نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔کوئی بھی کردار سیاست پر معاشیت کو ترجیح دیتا ہوا نظر نہیں آتا بلکہ اُلٹا سیاست کی وجہ سے گھر کی معاشی حالت بالکل ہی دردِ سر بن کے رہ جاتی ہے کیونکہ اس گھر کے کسی فرد کو معاشیت کے موضوع پر بات کرنے کو فرصت ہی نہیں ملتی۔ بڑے چچا اگرچہ کانگریسی ہے تو چھمی لیگی ہے۔ بڑے چچا کانگریسی ہونے کی وجہ سے ایک طرف اسی گھر میں کانگریس کے جلسے کرواتے ہیں:

> ''گلی میں کانگریسی بچوں کا جلوس نکل رہا تھا۔وہ بڑے بے ہنگم طریقے سے شور مچا رہے تھے۔''جھنڈا اُونچا رہے ہمارا۔۔۔کانگریس زندہ باد، گاندھی جی زندہ باد، جواہر لال نہرو زندہ باد، ہندوستان نہیں بٹے گا، جھنڈا اونچا رہے ہمارا۔۔'' [19]

بڑے چچا کے مخالف چھمی ہمیشہ اپنے طفلانا انداز میں جلسے منعقد کرواتی ہے اور اپنے من کی بھڑاس نکالتی رہتی ہے جس وجہ سے گھر میں ہمیشہ تناو بھرا ماحول چھایا رہتا ہے۔ چھمی اپنے چچا کے کانگریسی ہونے کی وجہ سے اس سے بہت نفرت کرتی ہے اور بچوں کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کی حمایت میں نعرہ بازی کرتی ہے اور بڑے چچا کو ستاتی رہتی ہے۔

> ''مسلم لیگ زندہ باد، قائدے اعظم زندہ باد، بن کے رہے گا پاکستان دھتیا راج نہیں

چلے گا، چڑیا راج نہیں ہوگا۔۔۔۔۔'' [۲۰]

ناول '' آنگن'' کا ہر کردار زمان ومکان کے مطابق ہے اور ہر مکالمہ کرداروں کی نفسیات کا آئینہ دار بھی۔اس تجزیہ سے یہ بات کم سے کم عیاں ہو جاتی ہے کہ ناول " آنگن " فنی طور سے ایک مکمل ناول ہے۔جس میں ہمیں ایک اچھے ناول کی لگ بھگ ساری خصوصیات مل جاتی ہیں، چاہے ناول کی کردار نگاری ہو، پلاٹ ہو،اسلوب ہو،یا مکالمہ نگاری ہو ہر سطح پر ناول " آنگن " فن کے اصولوں پر پورا اُترتا ہے۔پروفیسر احتشام حسین اس ناول کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی جستجو ایک ذہین قاری یا ناقد کسی ناول میں کر سکتا ہے۔کہانی کا ارتقاء بالکل فطری اور منطقی انداز میں ہوا ہے اور اپنی ساری وسعتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہوا ہے۔یعنی ناول کے ابواب مختصر افسانوں سے نہیں،ارتقاء کی مختلف کڑیوں اور منزلوں سے مرتب پاتے ہوئے منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔اسی میں ناول نگاری کی تعمیری صلاحیت اور فنی قدر کا پتہ چلتا ہے۔خدیجہ مستور نے بڑی خوبصورتی سے اس پیچیدہ عمل کو فطری اور سبک بنا دیا ہے۔ناول کے ہر کردار نے اپنا پارٹ اس خوبی اور خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ نہ تو کہیں داستان میں جھول پڑتا ہے نہ پس منظر غیر فطری ہوتا ہے اور نہ مقصد فن کو یا قصہ کی دلکشی کو مجروح کرتا ہے۔حسنِ ادا اور لطفِ بیان کے علاوہ یہی باتیں ہیں جن کی تمنا ایک ناول پڑھتے وقت کی جا سکتی ہے۔خدیجہ مستور کا بیان دلآویز اور اسلوب فنکارانہ ہے اسی وجہ سے اس ناول میں تقریباً فنی خوبیاں نظر آتی ہیں''۔[۲۱]

ناول " آنگن " تحریکِ آزادی پر لکھا گیا ایک ایسا ناول ہے جس میں فنکار نے سلیس اور سادہ زبان میں مگر استعاراتی پیرائے اظہار کا استعمال کیا ہے۔جس میں اس دور کی چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ناول نگار نے ناول کے بیان میں کسی بھی جگہ جانبداری کا سہارا نہیں لیا ہے۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے ایک مضمون میں ناول ' آنگن ' کے حوالے سے اظہارِ رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ناول آنگن کی ضخامت اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن پھر بھی اس میں تحریکِ آزادی اور

تقسیم کے المیے کا جیتا جاگتا نمونہ مل جاتا ہے۔''[۲۲]

ناول "زمین" خدیجہ مستور کا دوسرا ناول ہے جس کو انہوں نے عمر کے اخری حصّے یعنی ۱۹۸۰ء میں اپنے قلم کی زینت بنایا۔ اس ناول میں مہاجرین کے حالات وکوائف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس ناول کے پسِ منظر میں تقسیم کے بعد کی صورتِ حال ہے۔ فسادات اور ہجرت کے بعد کیمپوں کی زندگی کا ذکر ہے اور اس کے بعد نئے پاکستانی معاشرے میں موجود متضاد طبقوں کی کشمکش اور سماجی رویوں کی تصویر کشی کی ہے۔ پاکستان میں بنتے بگڑتے حالات کا ایک خاکہ آنکھوں کے سامنے چھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف اپنی کتاب میں اس ناول کا تعارف کچھ یوں کرواتے ہیں:

> "خدیجہ مستور کا دوسرا ناول "زمین" ایک طرح سے 'آنگن' کی توسیع ہے۔ اس کا آغاز لاہور کے والٹن کیمپ سے ہوتا ہے جہاں ساجدہ اپنے باپ رمضان کے ساتھ پناہ گزین ہے۔ یہاں ان کی ملاقات ناظم سے ہوتی ہے جو محکمۂ بحالیات میں ملازم ہے۔ کیمپ میں باپ کی موت ہو جانے پر ساجدہ بے یار و مددگار ہو جاتی ہے اور ناظم اس کو اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے۔ انتہائی ایمانداری، نیک نفس اور کشادہ ذہن شخص ہونے کی بنا پر ناظم نئے پاکستانی معاشرے میں مذہبی تنگ نظری، معاشی لوٹ کھسوٹ اور شخصی آزادیوں پر عائد پابندیوں کے خلاف عمل پیرا تھا جبکہ اس کا بھائی کاظم انتہائی خودغرض اور ہوس پرست انسان ہے''۔[۲۳]

ناول ''زمین'' موضوعاتی لحاظ سے جہاں ناول ''آنگن'' کی توسیع معلوم ہوتا ہے وہیں فنی اعتبار سے بھی دونوں ناول ایک ہی قالب سے نکلے ہوئے فن پارے نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ بات بھی روزِ تاباں کی طرح عیاں ہے کہ ناول "زمین" اس مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ پایا ہے جس پر ناول "آنگن" فائض ہوا۔ ناول "زمین" کے فن کے حوالے سے متضاد نظریات سامنے آتے ہیں کچھ اس کے حق میں اور کچھ اس کے رد میں۔ اپنے نظریات پیش کرتے ہوئے شبنم آرا اپنی کتاب "تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول" میں ناول "زمین" کے موضوع اور پیشکش پر سوالیہ نشان کھڑا کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

> '' خدیجہ مستور کا ناول "زمین" موضوعات و مسائل اور پیشکش دونوں ہی اعتبار سے کمزور ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں متعدد مسائل کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہیں

لیکن کرداروں کی نفسیات میں اتر کر اسے نوک قلم پر لانے میں ناکام رہی ہیں‘‘۔ [۲۴]

شبنم آرا نے اپنے فہم اور طبعیت کے اعتبار سے جو صحیح پایا ہے انہی خیالات کی ترجمانی کی ہے۔لیکن ادب کے معاملے میں کسی کی رائے بھی حتمی نہیں مانی جاتی ہے یہاں پر ہر کسی کے لیے میدان کھلا ہوتا ہے۔البتہ اپنی رائے قلمبند کرتے وقت ایک ناقد کو فن پارے کے زمان ومکان سے آگہی ہونی چاہیے۔تب جاکے وہ مدلل اور قابلِ اعتبار نتائج وعواقب رونما کرسکتا ہے۔ڈاکٹر خالد اشرف اپنی کتاب "برِصغیر میں اردو ناول" میں ناول "زمین" پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "زمین" کے مطالعے سے تقسیم کے بعد قائم ہوئے نئے پاکستانی معاشرے کی جو صورتحال سامنے آتی ہے وہ نہایت مایوس کن اور مریضانہ ہے۔ حالانکہ یہ ناول "آنگن" کے معیار کو نہیں پہنچتا"۔ [۲۵]

ناول پر بات کرتے ہوئے مندرجہ بالا دونوں ناقدوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدیجہ مستور کا ناول "زمین "فن کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا اور اس میں فلاں فلاں کوتاہیاں ہیں۔دونوں ناقدوں کی آراء قابلِ دادوتحسین ہے اور قابلِ اعتبار بھی لیکن تجزیہ کرتے وقت صرف کسی ایک چیز کو ہدفِ تنقید بنا کر ساری خوبیوں کو نظرانداز کرنا انصاف کے مخالف ہے۔تجزیہ کرتے دوران دونوں اس بات کی وکالت کرتے ہیں کہ فن کار فن کے بوجھ تلے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پائی ہے اور تقسیم کے مسائل کو کرداروں کے ذریعے پیش نہیں کر پائی ہے۔جس کی وجہ سے مصنف کے ذریعے پیش کردہ تصویر اور صورتحال مایوس کن اور مریضانہ نظر آتی ہے۔لیکن صرف ان دونوں کی آراء پر اس ناول کا کم درجہ مان لینا علمی بددیانتی اور جہالت ہوگی جبکہ یہ تصویر کا صرف ایک ہی رخ ہے۔مصنفہ کے دونوں ناول پڑھتے وقت یہ بات اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ ناول 'زمین'، 'آنگن' کے درجے کا نہیں ہے البتہ اتنا بھی گیا گذرا نہیں ہے جتنا مندرجہ بالا تجزیہ نگاروں نے اس کو گردانا ہے۔متذکرہ ناول موضوع ،مواد اور اسلوب کے اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے البتہ ناول کی پیشکش میں کہی کہی پر فن کار نے جلد بازی سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے ناول ڈھیلہ ڈھالا نظر آتا ہے لیکن سنجیدگی سے ناول پڑھتے وقت مجموعی طور پر یہ ناول تقسیم اور قیامِ پاکستان کے حوالے سے ایک گہرا تاثر چھوڑتا ہے جو بہت سارے ناولوں میں نظر نہیں

آتا ہے۔ڈاکٹر محمد نسیم ناول "زمین" کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمارے اذہان مخالف سمت لے جا کر متذکرہ ناول کو ایک کامیاب ناول قرار دیتے ہیں۔وہ "زمین" کے حوالے سے فن کار کی فنی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب "اردو ناول پر تقسیمِ ہند کے المیے کے اثرات" میں رقمطراز ہیں:

"............اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خدیجہ مستور نے تاریخ کے تناظر میں ذاتی مشاہدے اور فنی تجربے کے امتزاج سے تقسیم ہند سے پیدا شداہ مسائل کو پیش کرنے میں بے باکی اور غیر جانبداری کو روا رکھا ہے۔زیرنظر ناول کے مطالعے کے بعد قارئین کے دل و دماغ پر نہ صرف المیے کے اثرات مرتسم ہوتے ہیں بلکہ وہ تقسیم ہند کی ٹریجڈی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتے ہیں"۔ [۲۶]

ناول "زمین" میں پیش کردہ مسائل اور تقسیم کے المیے کا جو منظر نامہ اس ناول کے ذریعے سے 'ڈاکٹر محمد نسیم' نے ہمارے سامنے لایا ہے وہ یقیناً حیران کن ہے۔موصوف کے اس منتقی تجزیہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ناول "زمین" میں پیش کردہ فن تک رسائی حاصل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔اس فن تک وہی رسائی حاصل کرسکتا ہے کہ جس نے خدیجہ مستور کے ناولوں کو گہرے فنی شعور کے ساتھ پڑا ہو اور یہ شعور ڈاکٹر محمد نسیم میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ناول "زمین" پر اظہارِ خیال کا اختتام وہ اس عبارت کے ساتھ کرتے ہیں:۔

''اس بحث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ''زمین'' تقسیم کے المیے کے موضوع پر ایک منفرد اور کامیاب ناول ہے۔خدیجہ مستور کا اندازِ بیان دلچسپ اور معلوماتی ہے۔'' [۲۷]

ناول ''زمین'' سے اگرچہ خدیجہ مستور کے فن کا گراف ''آنگن'' کے مقابلے میں بلند تو نہیں ہوا لیکن ''زمین'' کی ایک علحیدہ شناخت ہے۔ناول ''زمین'' کے کینوس میں قیامِ پاکستان اور مہاجرین کے مسائل سے متعلق واقعات کا تجزیہ ہے۔''آنگن'' کا قصہ جہاں ختم ہوتا ہے وہیں سے ''زمین'' کی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔لوگوں کی آس تھی کہ فرنگیوں کی غلامی سے آزاد ہوکر سارے مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں گے اور دونوں قومیں (ہندو اور مسلم) آزاد قوموں کی حیثیت کے بطور ابھریں گیں لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔''زمین'' ان لوگوں پر اچھا طنز ہے جو نئے ملکوں میں آباد ہوکر اپنے ماضی کو بھول کر دولت سمیٹے اور

چھچھورے پن دکھانے میں مصروفِ عمل رہے اور ان لوگوں پر بھی جو بیورو کریسی اور سیاست کے نمائیندے بن کر عوام پر حکمرانی کرنے لگے۔خدیجہ مستور کے ناول زمین میں لاہور کے والٹن کیمپ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔جن میں ایک کردار 'بوڑھا' بھی ہے جو'' آنگن'' کے اسرار میاں کی یاد دلاتا ہے۔مصنفہ نے اس میں حال کی عکاسی کے ذریعے سے تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کی تازہ ترین صورتحال کی تصویر کشی کی ہے۔جس سے اس دور کی سچی تصویر آنکھوں کے سامنے جابجا آ جاتی ہے۔ملاحظہ ہو:

''عورتوں اور مردوں کے چہروں پر سے بے سروسامانی برستی ہوتی۔حالانکہ سب نے اپنا ٹھکانہ بنالیا تھا۔فوجیوں کی خالی کی ہوئی لمبی لمبی بدرنگ بارکوں میں، درختوں کے سائے تلے، دریوں کی چھتوں کے نیچے، تمبوؤں کے پُراسرار اندھیروں کے اندر زمین کے اس ٹکڑے نے سب کو پناہ دے دی تھی۔اس نے سب کے قدموں کی تھکن اپنے سینے میں جذب کر لی تھی۔ [۲۸]

ناول "زمین" چونکہ ناول " آنگن " کی ہی توسیع ہے اس لئے دونوں کا پلاٹ بھی لگ بھگ ایک ہی منبع سے اخذ کیا ہوا لگتا ہے لیکن ناول "زمین" پڑتے ہوئے کہیں کہیں پر پلاٹ میں جھول سا محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے ناول کا تسلسل کسی کسی جگہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اتنا ڈھیلا ڈھالا بھی نہیں ہے جو سراسر عیب معلوم ہو بلکہ بیانیہ تکنیک میں ایسے جھول پیدا ہونا اتفاق ہی سمجھا جاتا۔

ناول کی کردار نگاری بہت ہی کامیاب نظر آتی ہے۔ناول کا ہر کردار فن کار کے گہرے مطالعے اور وسیع مشاہدے کا غماز نظر آتا ہے۔ ہر کوئی کردار اپنی سونپی ہوئی ذمہ داریوں کے عین مطابق نظر آتا ہے۔ناظم، کاظم، ساجدہ، سلیم، تاجی، مالک (ناظم کے والد) اور خالہ بی کے علاوہ رمضان اور بوڑھا بابا اس ناول کے اہم کرداروں میں قابلِ ذکر ہیں۔ناول کا لگ بھگ ہر کوئی کردار اپنی فطرت پر ڈٹا ہوا نظر آتا ہے، اکثر کردار آنگن کے کرداروں کا ہی سایہ معلوم ہوتے ہیں۔شبنم آرا اپنی کتاب " تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول " میں ناول "زمین " کے کرداروں کا ناول " آنگن " کے کرداروں سے تقابل کرتے ہوئے یوں لکھتی ہیں:۔

"زمین" کی ساجدہ اور سلیمہ بہت حد تک '' آنگن'' کی عالیہ سے مشابہت رکھتی ہیں۔

ان کے احساسات وجذبات اوران کا بالیدہ شعور عالیہ کی یاد دلاتا ہے۔زمین کے یہ دونوں کردار جس انجام کو پہنچتے ہیں وہ ان کے اسی شعور کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جو آنگن میں عالیہ کے انجام کا سبب بنا تھا۔صلاح الدین بھی بالکل صفدر کی تصویر ہے۔ابتداء میں نہایت معصوم اور آئیڈیل لیکن حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نہایت مکروہ سمجھوتے کرنے والا۔'زمین' کا اختتام بھی ''آنگن'' کے ہی نقش قدم پر ہوتا ہے۔صلاح الدین جس کا اس نے ایک عمرانتظار کیا لیکن جب وہ ملتا ہے تو بالکل بدلی ہوئی حالت میں''۔ [۲۹]

اس ناول کے فعال کرداروں میں ناظم اور ساجدہ کے کردار قابلِ ذکر اور قابلِ مطالعہ کردار ہیں۔دونوں کردار ظالم سماج سے لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اسی لئے ناظم ہیرو اور ساجدہ اس ناول کی ہیرائن قرار پائی ہے۔دونوں کے کردار پُرکشش اور دلچسپ ہیں، جو اپنی طرف مائل کئے بغیر نہیں رہتے۔ناظم نہ ہی وقت کے ساتھ مصلحت کرتا ہے نہ ہی وہ انجام سے ڈرتا ہے بلکہ پاکستان کی تشکیل اپنی آرزؤں اور اُمنگوں کے مطابق دینا چاہتا ہے، چہ جائے کہ غلط طرزِ حکومت کی بنا پر وہ اپنے متعین شدہ مقصد کو حاصل نہیں کر پاتا لیکن وہ آخری دم تک اس ظالم نظام کے خلاف جدوجہد کرتا رہتا ہے اور صعوبتیں اور مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔ناظم زمانے کی تلخیوں سے لڑتے لڑتے اکثر ظالموں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ظالم حکمران اس کو خاموش رکھنے کے لئے الگ الگ ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں۔لیکن وہ ایک سچے پاکستانی محبّ کے طور پر جیل جانا پسند کرتا ہے لیکن ظالم حکومت کے سامنے جھکتا نہیں۔ساجدہ بھی اسی طریقے سے بہت سے مظالم سہہ کے ہیروئن کے درجے پر فائض ہوئی ہے۔وہ تنکے کی مانند حالات کے بہاو کے سہارے چلنے کے بجائے اپنی دنیا آپ بسانے کو ترجیح دیتی ہے۔وہ ایک طرف جہاں تاجی کے استحصال پر احتجاج کرتی ہے دوسری طرف بادلِ نخواستہ تاجی کو بچانے کی خاطر ہسپتال بھی لے جاتی ہے۔ڈاکٹر محمد نسیم اس تناظر میں اپنی کتاب "اردو ناول پر تقسیمِ ہند کے المیہ کے اثرات" میں ناول "زمین" کی کردار نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''ناظم زیرِنظر ناول میں ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے۔اسے سیاست سے خاصی دلچسپی ہے جس کے تحت اس نے کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں جھیلی ہیں اس کا آبائی وطن

> کانپور تھا۔ تقسیم ملک اور قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے.......................وہ جمہوریت، انصاف اور مساوات پر مبنی نظام حکومت کا متمنی ہے جب کہ حکومت ایسے خیالات کو بغاوت پر محمول کرتی ہے۔ لہٰذا اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے.......ساجدہ ناول کی ہیروئن ہے''۔[۳۰]

ساجدہ کے والد کا نام رمضان ہوتا ہے جو دہلی میں ایک کپڑے کی دکان میں منشی گری کا کام کرتا تھا۔ ملک کی تقسیم اور پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ساجدہ اپنے والد کی معیت میں ہجرت کر جاتی ہے اور لاہور کے والٹن کیمپ میں پناہ گزین ہوتی ہے۔ والد کی موت کے بعد یہیں سے ناظم اسے اپنے گھر لاتا ہے اور کچھ دنوں کے بعد دونوں ازدواجی رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ ناظم اور ساجدہ جہاں اس ناول میں زمانے کے سرد وگرم اور برداشت کرنے کی وجہ سے اپنی طرف مائل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طریقے سے کاظم اور خالہ بی کے منفی رول ادا کرنے کی وجہ سے گویا انہوں نے اپنے آپ کو ظالموں میں شمار کروایا ہے۔ کاظم اس ناول کا وہ ہوس پرست اور اور ظالم کردار ہے جو " تاجی " کو بار بار اپنی ہوس کا شکار بنا کے اس کو آخر کار اس کو موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ ڈاکٹر محمد نسیم اس تناظر میں رقمطراز ہیں:۔

> " کاظم کا کردار بد خلقی، بدکرداری اور جنسی اوباشی میں اپنی مثال آپ ہے"۔[۳۱]

کاظم کے ذریعے سے خدیجہ مستور نے دراصل ایسے انسانوں کی نمائندگی کی ہے جو رزیلانا کردار کے حامل ہونے کے باوجود بھی ایک ایسے ملک کے حاکم بننے میں کامیاب ہوئے جو کہ صریح اسلامی بنیادوں پر الگ کیا گیا تھا۔ کاظم جیسے بدکردار اور عیاش حاکم بننے سے خدیجہ مستور نے اس بات کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے کہ پاکستان جس مقصد کے لئے متحدہ ہند سے الگ ہوا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی سیاست پر جن خود غرض لوگوں نے قبضہ کیا انہوں نے پاکستان کو ذہنی و جذباتی طور پر نقصان پہنچایا۔ کاظم جو کہ ایک سب ڈویزنل مجسٹریٹ ہوتا ہے اپنے عہدے کا خوب ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دل کھول کر ملک کا استحصال کرتا ہے۔ جو اپنے گھر کی نوکرانی تاجی کو بار بار اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اس کے بعد ساجدہ کو مجبور پا کر اس کا شکار بھی کرنا چاہتا ہے۔ ناول کے ذریعے سے مصنفہ نے یہ بات بھی منصۂ شہود پر لانے

کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کے امراء نے تقسیم سے متاثرہ عورتوں کو کیسے اپنی جنسی تسکین کا ذریع بنایا۔

خالہ بی اپنی سخت طبعیت اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ظالم کردار کے طور پراُ بھر کر سامنے آتی ہے۔وہ تاجی کے ساتھ ساتھ گھر کے تمام افرادِ خانہ کو ہمیشہ مرعوب کر کے ان پر احکام صادر کرتی رہتی ہے۔ ہر کسی کا جینا حرام کرتی رہتی ہے۔اپنی کھڑوس طبعیت کی وجہ سے سلیمہ اور ناظم کے والدین کے رشتے میں تلخی کی زبردست خلیج پیدا کر دی۔تاجی کی بربادی، صابرہ کی ویرانی اور سلیمہ کے ٹیڑھے پن کی ذمہ دار بھی کہیں نہ کہیں خالہ بی ہی ہوتی ہے ۔ناول "زمین" کا سب سے بڑا مظلوم کردار "تاجی" کا ہے۔جس کو ناظم لاہور کے والٹن کیمپ سے لاتا ہےلیکن یہاں پراس کا بھائی کاظم اس کو اپنی ہوس کا شکار بناتا رہتا ہےاور آخر اس کے مرنے کی بھی یہی وجہ بنتی ہے۔شبنم آرا اپنی کتاب "تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول" میں تاجی کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہے:۔

> "زمین" میں تاجی کا کردار نہایت مظلوم داشتہ کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ پناہ گزین لڑکی تاجی جو مالک صاحب کے گھر میں بحیثیتِ نوکرانی ہے مردانہ ہوس کا شکار ہوکر موت سے ہمکنار ہوجاتی ہے"۔[۳۲]

ساجدہ کی پڑوسن لالی کا کردار بھی ایک قاری کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ جو اپنے شوہر کے ظلم وستم سہہ کر بھی کوئی شکایت کرنے سے گریزاں ہے۔ وہ ہر بار شوہر کی مار سہہ کر بھی اس کے ساتھ کسی نہ کسی وجہ سے ازدواجی رشتہ قائم کرتی ہے۔ساجدہ جب زمیندار کے بُرے سلوک کی بات کرتی ہے تو لالی سکتے کی حالت میں آجاتی ہے۔

> ’’نہیں بس غصے کے برے ہیں اور میرے باپ نے بھی تو اچھا نہیں کیا انہیں دھوکہ دیا‘‘۔[۳۳]

اس ناول میں جہاں ہر کوئی کردار اپنے منفرد عادات واطوار کی وجہ سے الگ الگ حیثیت رکھتا ہے وہیں اس ناول میں ایک ایسا کردار بھی پایا جاتا ہے جس کے تذکرہ کے بغیر کردار نگاری کا حق ادا نہیں ہوگا۔اس کردار کو ہم اس ناول میں سلیمہ کے نام سے جانتے ہیں۔سلیمہ اس ناول کا وہ کردار ہے جو کہ ہیروئن بھی نہیں ہے لیکن اس کے خصائص وخصائل دیکھ کر اس کو اس درجہ سے نیچے رکھنا بھی اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ وہ ایک دلیر اور بہادر عورت کی طرح مخالف حالات کو موڑنے کا عزم رکھتی ہے، بلکہ عزم ہی

نہیں رکھتی عملی میدان میں بھی حالات بدلتی ہے۔ذہین اور زیرک بہت زیادہ، تجربہ اتنا کہ واقعات رونما ہونے سے پہلے ہی ان کو بھانپ لیتی ہے۔شبنم آرا" سلیمہ " کے کردار پر کچھ یوں راشنی ڈالتی ہے:۔

> ''سلیمہ کا کردار اعلٰی تعلیم یافتہ اور خود مختار کردار کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ جو ایک دانشورانہ سوچ رکھتی ہے، اپنی ماں کے غلط رویے سے بدظن رہتی ہے۔کالج میں نوکری کرتی ہے اس لئے معاشی محکومیت سے آزاد ہے۔گھریلو ماحول سے بیزار ہونے کی وجہ سے ہاسٹل میں پسند کرتی ہے اور اپنی زندگی میں کسی مرد کا تصور نہیں کرتی''۔[۳۴]

ناول کا اسلوب بہت ہی دلکش اور دلفریب ہے۔ناول " آنگن " کی ہی طرح اس ناول کا اسلوب بھی آسان اور سلیس ہے۔ناول کے ابتداء سے انجام تک شاید ہی کوئی ایسا لفظ دکھائی دیتا ہے جو سمجھنا مشکل ہو بلکہ الفاظ اتنی سادگی لئے ہوئے ہیں کہ عام قاری کو بھی ان کو سمجھنے میں کوئی دقت درپیش نہیں ہوتی۔کوئی بھی فن پارہ چونکہ مفادِ عامہ کے لئے ہوتا ہے اس لئے بہترین فنکار وہی کہلایا جاتا ہے جو قارین کی طبعیت کے مطابق لکھتا ہے ورنہ فن پارہ بالکل بے سود اور بے معنی سا ہو جاتا ہے۔خدیجہ مستور کے ہاں یہ خوبی بہ درجہ اتم پائی جاتی ہے انہوں نے دونوں ناولوں میں عمومی طور پر اور ناول 'زمین' میں خصوصی طور پر اس چیز کو برتا ہے۔علمی لحاظ سے وہ بھی چاہتی تو بعض فنکاروں کی طرح قاری کو الفاظ کے گھورکھدندے میں الجھا سکتی تھی مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا ہے کیونکہ ان کے پیشِ نظر فنکارانہ دکھاوٹ نہیں تھی بلکہ ان کے سامنے ایک خاص لائحہ عمل تھا جس کے تحت وہ اپنے ناول ترتیب دیتی تھی اور اس لائحہ عمل کے اظہار کے لئے انہوں نے سادہ، شیریں اور آساں الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔نیلم فرزانہ اس ناول کی زبان کی سادگی کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> "اس ناول کی زبان ''آنگن'' کی طرح صاف ستھری اور حقیقت پسندانہ ہے۔تشبیہ و استعارے بھی وہی استعمال ہوئے ہیں جو ''آنگن'' میں استعمال کئے جا چکے ہیں"۔[۳۵]

مکالمہ نگاری عین کرداروں کے مطابق نظر آتی ہے۔جس سے ہر کسی کردار کی نفسیاتی کیفیت ہم پر عیاں ہو جاتی ہے۔مکالمہ نگاری میں ایک فنکار کو زمان و مکان کا چونکہ بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔جس کی بھرپور جھلک خدیجہ مستور کے دونوں ناولوں میں ہمیں بجا طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ناول کے آغاز میں

ہی بوڑھے کا وہ زور زور سے چلانا جہاں تقسیم کے المیے کے حوالے سے بہت زیادہ ضروری ہے، وہاں یہ مکالمہ ایک قاری کو آغاز میں ہی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور ساجدہ کا اس بوڑھے کو تسلی دینا مکالمہ نگاری کے حوالے سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دلچسپ مکالمہ کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:۔

> "میری بیٹی، میری بیٹی، میری بیٹی کہاں ہے؟ بوڑھا اپنے بال نوچ کر زور زور سے چیخا اور پھر گھنٹوں وہ ایک ہی طرح سے سر جھکائے بیٹھا رہتا"۔
>
> ....، "بابا! تم کس بیٹی کو پکار رہے ہو؟ وہ بیٹی نہیں تھی بابا! وہ لُوٹ کا سب سے قیمتی مال تھی۔ وہ تمہارے چیخنے سے واپس نہیں آئے گی۔ تمھاری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔" [۳۶]

اس اقتباس سے خدیجہ مستور کے فن کا برملا اعطراف ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑی فنکارہ ہے۔ انہوں نے اس ناول میں مکالموں کے ذریعے تقسیم اور تقسیم سے پیدا شدہ حالات کی ایسی نمائندگی کی ہے کہ پڑھتے ہی قاری کے ذہن پر انہی حالات و واقعات کے نقش ثبت ہو جاتے ہیں جو موصوفہ نے اپنے فن کے ذریعے سے چاہے ہیں۔ ان مکالموں میں ایک مخصوص دور کا درد و کرب بڑے لطیف انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ بیٹیوں کے کھو جانے کے بعد ان کے والدین پر کیا بیتی اس کے نقش و نگار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ناول نگار نے اپنے مقصد کے حصول یعنی ساجدہ کے کردار کو واضع کرنے پر ہی سارا زور صرف کر دیا ہے۔ ساجدہ کے تجربات، مشاہدات اور تصورات بھی ناول کے کینوس پر پھیلے ہوئے ہیں۔ موصوفہ کی اس فنی صلاحیت کو تو ماننا پڑے گا کہ وہ جس واقعہ کو پیش کرتے ہیں اس کی تاثیر شدت کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ واقعات کے زورِ اثر اور فطری اندازِ بیان کو ان کی مکالمہ نگاری نے تقویت پہنچائی ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا بھی ہوا ہے کہ مکالمے ہی ناول کے کردار کی خصوصیت کو روشن کرتے گئے ہیں۔ مکالمہ نگاری کا رنگ فطری ہے اور اس کی وجہ سے واقعہ نگاری کے دوران بھی بے تکلفی اور برجستگی برقرار رہتی ہے۔ ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ ان میں سے کوئی واقعہ بالکل فرضی ہے۔ واقعہ بے جوڑ تو ہو گئے ہیں لیکن ان کی ارضیت اور صداقت اندازِ بیان کی تازگی اور زبان کی سادگی پر قائم رہتی ہے۔ اسی طریقے سے تاجی جن الفاظ میں ساجدہ کو اپنی زندگی کی روداد اور تقسیم ملک کی ہولناکیوں کے احوال سناتی ہیں وہ آنکھوں میں آنسوں لائے بغیر نہیں رہتے۔

ملاحظہ ہو:

> ''پاکستان بن گیا باجی! فساد شروع ہوگئے۔کسی کو ذات برادری کی خبر نہ رہی۔میری ماں نے مجھے ایک قافلے کے ساتھ ڈھکیل دیا، کہتی تھی اپنے ملک میں جاکر کسی شریف آدمی کا ہاتھ پکڑ لیجیو، اور پھر وہ کڑے والے ہاتھ کو تھام کر غائب ہوگئی''۔[۳۷]

ہجرت کے جانکاہ ماحول میں عورتوں کی پامالی اور ان کا استحصال عروج پر تھا۔ناول میں تاجی کا کرداراس دور کی مہاجر عورتوں کا المیہ ہے جنہوں نے اپنی عصمت وعفت کے تحفظ کے لئے ہجرت کی تھی۔تاجی کے کردار کے ذریعے سے مصنفہ نے جہاں اس ناول میں بہت سارے پیغامات دینے کی کوشش کی ہے وہاں اس نے اس حقیقت کو بھی باور کرانے کی سعی بھی کی ہے کہ تقسیم کے وقت جو عورتیں اس آس پر ہجرت کر گئیں کہ ہندوؤں سے بچ کر اپنے مذہب کے لوگوں میں تحفظِ ناموس محفوظ رہے گی لیکن شومۂ قسمت وہ نہیں ہو پایا۔جس ڈر کی وجہ سے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کر رہیں تھیں ہجرت کرنے کے باوجود بھی ان سے وہ ڈر ختم نہ ہوا۔اگر چہ ہندوستان میں ان کی عصمت غیر قوم یعنی ہندوؤں کے ذریعے سے تارتار ہوئی لیکن پاکستان ہجرت کر کے اُن کو اپنے ہی قوم و مذہب کے ماننے والوں نے استحصال کا نشانہ بنایا۔تاجی کے کردار کے ذریعے سے مصنفہ نے شدت کے ساتھ اس حقیقت کو واضع کرنے کی سعی کی ہے کہ تقسیم کا المیہ یہ رہا کہ نئے ملک پاکستان سے لوگوں نے وہ امیدیں باندھی ہوئیں تھیں جن کا پورا ہو جانا بعید از عقل تھا کیونکہ ہجرت تو آخر وہیں لوگ کر رہے تھے جو پہلے ایک ہی خطے میں پلے بڑھے تھے۔ایسے میں مہاجر لوگ بنا تربیت اور نظم وضبط کے بغیر ہی ایک ایسے ملک کی بنیاد کیسے رکھ سکتے تھے جس کا دستور پہلے والے ملک سے قطعی جدا ہو۔ جہاں کا رہن صحن الگ الگ ہو۔نتیجتاً اس نئے ملک میں بھی وہیں حالات جاری رہیں جن کی روک کے لئے اس نئے ملک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔تاجی کی مظلومیت اور کاظم کے اُس پر ظلم ڈھانے سے ایک غیر جانبدار قاری کے لئے شاید یہ بات سمجھنی کوئی مشکل نہیں ہے کہ قیامِ پاکستان کا مقصد کہیں نہ کہیں ادھورا رہا۔ماؤں نے اپنی آبروؤں کا سودا کر کے جس آس سے اپنی بیٹیوں کو پاکستان بھیجا تھا وہ ریت کا ڈھیر ثابت ہوئیں۔پاکستان میں اس آس کی کوئی لاج نہ رکھی گئی۔وہاں پر سب کچھ پہلے جیسا ہی رونما ہونے لگا۔تاجی کا یہ جملہ اس حوالے سے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے:

''وہ شریف ہاتھ نہیں ملا۔اماں! نہیں ملا،کوئی نہیں ملا،میرے۔۔۔'' پھر آواز ڈوب سی گئی"۔[۳۸]

ناول "زمین" کی تکنیک بھی ناول "آنگن" کی طرح بیانیہ ہی ہے،البتہ ناول "آنگن" میں فن کار نے یادوں کا سہارا لے کر فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا اور ناول "زمین" میں ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔خدیجہ مستور کے فن میں چونکہ یہ بات بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ فکشن کو حقیقت کا روپ دیتی ہے اور حقائق کو فکشن کے قالب میں ڈھالتی ہے۔ناول "آنگن "جہاں تقسیم تک محیط ہے وہیں ناول "زمین" تقسیم کے بعد کے دور پر محیط ہے،یعنی دونوں ناول حقائق پر مبنی تقسیم کے پسِ منظر اور پیشِ منظر کا ایک انمول نمونہ ہے۔ڈاکٹر سید جاوید اختر اپنی کتاب "اردو کی ناول نگار خواتین" میں ناول "زمین" کی تکنیک پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

''تکنیکی اعتبار سے "زمین" بھی حقیقت نگاری کی روایت میں لکھا ہوا ایک معا شرتی ناول ہے۔جس میں ساجدہ تاجی،ناظم،کاظم،سلیمہ اور خالہ بی وغیرہ کے کردار ایک گھر میں مقیم افراد کے متضاد طبقاتی رویوں اور خواہشوں کا اظہار کرتے ہیں۔اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہر کردار اپنے سماجی تجربے کی بنیاد پر اپنی شناخت کے نئے مرحلے میں ہے۔قیامِ پاکستان کے بعد یہ کشمکش ہر طرف نظر آتی ہے۔یہ وہ ابتدائی دور تھا۔جب لوگوں کی کایا کلپ ہو رہی تھی اور مفادات نئے سانچوں میں ڈھل رہے تھے۔''[۳۹]

ناول کا موضوع ناول ''آنگن'' کی توسیع ہے۔تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے مہاجروں کو کن مسائل سے دوچار ہونا پڑا،تقسیم کا نظریہ کہاں تک صحیح تھا،اور اس حوالے سے کیا نتائج اخذ ہوئے،اس کو ناول نگار نے اپنے اس ناول کا موضوع بنایا ہے۔ناول کے پسِ منظر میں ہی فن کار نے یہ پیغام دیا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے انگریزوں سے ایک منظّم تحریک کے بلبوتے پر ہی آزادی حاصل کی۔اُس کے بعد فن کار نے اقدار کی شکست و ریخت،تقسیم کے المیے،فسادات اور ہجرت وغیرہ کے بعد مہاجروں کی ابتر حالات سے بحث کی ہے۔عام مسلمانوں نے جس پاکستان کے لئے قربانیاں دیں،مظالم سہے،رنج والم کو جھیلا اُن کی آس کا وہاں پر کوئی چیز نہیں ملا،بلکہ وہاں پر سارے منظر متضاد دیکھنے کو ملے۔جس آئیڈیل ملک

کے لوگوں کو خواب دکھائے جا رہے تھے وہاں پر ویسا کچھ بھی نہ تھا۔ مسلمان جس آس، ایمان وایقان اور جان و مال کی محافظت کے ضامن والے ملک میں ہجرت کر رہے تھے اس ملک میں ان کی امیدوں کے مطابق کچھ بھی نہ تھا۔ ان کی نظر میں اس کا مقام مدینۃ الثانی جیسا تھا لیکن بہت جلد ان کو یہ پتہ چلا کہ یہاں کے عام لوگ جھوٹے، ارباب اقتدار ظالم اور ہوس پرستی کے عالم میں دھت ہیں۔ جس نظام کے لئے یہ ملک بنا تھا اس نظام کو وہاں کے بدنیت اور بدخصلت اربابِ اقتدار نے شرمندۂ تعبیر ہونے نہیں دیا۔ حد تو یہ ہے کہ جو شخص ان کو اس ملک کے اصولوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے اس کو سیفٹی ایکٹ کے انعام سے نوازا جاتا ہے اور جو اس ملک کے منشور کی دھجیاں اُڑاتا ہے اس کو قوم کا حاکم اعلیٰ بنایا جاتا ہے۔ فنکار نے بڑی جرأتمندی اور غیر جانبداری سے اس تلخ حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے جس کو عام فن کار پیش کرنے سے قاصر ہی رہے ہیں۔

تقسیم اور فسادات کے بعد مہاجر کیمپوں میں مہاجرین کے حالات وواقعات کی اس ناول میں خوب منظر کشی ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید جاوید اختر ناول کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب "اردو کی ناول نگاری خواتین" میں لکھتے ہیں:۔

> ''زمین" ایک ایسا پوٹریٹ ہے جس کے کینوس میں اگرچہ شوخ رنگوں کی دھنک نہیں دکھائی دیتی تاہم اس کی سادگی اور سچائی اسے معتبر کرنے کے لئے کافی ہے۔ 'آنگن' کے پیٹرن پر 'زمین' کو بھی خاندان کے چند افراد کے ذکر سے قیامِ پاکستان کے ابتدائی زمانے کی ایک دستاویز میں بدل دیا گیا۔ پسِ منظر میں برطانوی حکومت سے آزادی کے لئے ایک جمہوری تحریک کا بیان ہے۔ پھر فسادات اور ہجرت کے بعد کیمپوں کی زندگی کا ذکر ہے اور بعد ازاں قصے کا اہم ترین حصہ آجاتا ہے، جس میں ایک گھر کے حوالے سے نئے پاکستانی معاشرے میں موجود متضاد طبقوں کی کشمکش اور سماجی رویوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔''[۴۰]

اس تجزیہ سے یہ بات روز تاباں کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ خدیجہ مستور ناول کے پیچ وخم پر اچھی گرفت رکھتی ہے۔ اپنے گہرے اور وسیع مطالعے کی وساطت سے وہ اپنے قاری کو فن کے گورکھ دھندے میں الجھا کر نہیں رکھتی بلکہ آسان انداز بیاں اپنا کر قاری کو پہلی ہی فرست میں اپنی طرف راغب کرتی ہے۔

جس سے تخلیق کے خلق کرنے کا بھی حق ادا ہوتا ہے اور قاری کے اس سے فیض یاب ہونے کا بھی۔

ناول ''آنگن'' اور ''زمین'' حقیقت نگاری کی اعلی مثال ہیں۔ جس میں مصنفہ نے غیر جانبدارانہ انداز میں ایک مخصوص عہد کو فکشن کے پیرائے میں سمویا ہے۔ مصنفہ چونکہ ان حالات کی براہ راست شاہد رہی ہے اس لیے اس نے اپنی ناولوں میں من وعن ان ہی واقعات کو جگہ دی ہے جو حقیقی زندگی سے ماخوذ ہیں یا کم سے کم حقیقی زندگی سے قریب تر ہیں۔ مصنفہ کے دونوں ناول اگر چہ برابری کے نہیں مانے جا سکتے لیکن یہ بات ضرور ماننی پڑتی ہے کہ دونوں ایک ہی منبع و سرچشمہ سے مستعار ہیں جس کی وجہ سے دونوں میں ایک گہرا ربط پیدا ہوا ہے۔ جب ہم پلاٹ کی بات کرتے ہیں تو دونوں ناولوں کا پلاٹ روایتی نظر آتا ہے۔ ان میں بیانیہ تکنیک کا استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے دونوں ناولوں کا پلاٹ مربوط ہے۔ دونوں ناولوں میں قصے میں مختلف النوع جہتوں سے دلچسپی پیدا کی گئی ہے۔ ناول آنگن میں قاری کی توجہ علامتی عنوان آنگن پر گامزن رہتا ہے۔ اسی طریقے سے ناول زمین میں بھی فن کار نے یہی طرز اختیار کیا ہے۔ یعنی زمین جو کہ ماں کے سمان (مادر وطن) قرار دی جاتی ہے جو کہ دونوں ملکوں کو انعام کے طور پر ملی لیکن لوگوں نے اس حاصل شدہ زمین کے ساتھ کتنا استحصال کیا۔ ماحول کے اعتبار سے دونوں ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ خدیجہ مستور نے ''آنگن'' میں اتر پردیش کے ایک مسلم خاندان کے عروج وزوال کو اس ناول کا محور و مرکز قرار دیا ہے۔ یہ خاندان متعلقہ عہد کے جملہ خاندانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طریقے سے ناول زمین تقسیم کے بعد لاہور کے والٹن کیمپ میں مہاجرین کے مسائل سے متعلق واقعات کی نمائندگی کرتا ہے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے دونوں ناول یکساں کامیاب نظر آتے ہیں۔ دونوں کے کردار متحرک اور فعال ہیں۔ ناول آنگن میں عالیہ کے بڑے چچا اور ان کے افرادِ خانہ کی روداد ہے۔ عالیہ، جمیل، چھمی، اسرار میاں، کریمن بوا اور نجمہ اس ناول کے نمایاں کردار ہیں۔ ناول زمین کے کرداروں کی سیرت نگاری میں بھی خدیجہ مستور نے ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ ناظم، کاظم، ساجدہ اور سلیمہ اس ناول کے نمایاں کردار ہیں۔ مرکزی اور ضمنی کرداروں کے ہجوم میں ساجدہ کو ہیروین اور ناظم کو ہیرو کا مقام حاصل ہے۔

مکالمہ نگاری، اندازِ بیان، جذبات نگاری اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے بھی ناول ''آنگن'' خدیجہ مستور کے فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسی طریقے سے ناول ''زمین'' کے مکالمے اور کردار ایک قاری کو اپنی طرف مائل کئے بغیر نہیں رہتے۔ ناول کی منظر نگاری عین حالات و واقعات کے مطابق ہے اور اسلوبِ بیان بھی

موصوفہ کی شخصیت اور ان کی گونا گوں صفات اور مختلف الجہات اہلیتوں کا آئینہ دار ہے

حواشی وحوالے

۱، (اردو ناول اور تقسیمِ ہند، عقیل احمد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ص ۱۶)۔

۲، (برصغیر میں اردو ناول، ڈاکٹر خالد اشرف، کتابی دنیا، دہلی، ص ۔۱۶۲/۱۶۱)

۳، (اردو ناول آزادی کے بعد، ڈاکٹر اسلم آزا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی۔ص ۔۲۸۴)

۴، (تقسیم ہند اور ناول کر ماں والی، شاہینہ اختر، میزان پبلشرز، ص ۔۹۹)

۵، (India wins freedom,Abul kalam Azad,PDF,p.no.,224)

۶، (اردو ناول: تنقید و تجزیہ، مرتب: ڈاکٹر سلیم محی الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی۔ص ۵۷)

۷، (اردو ناول آزادی کے بعد ،۔ڈاکٹر اسلم آزاد ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۔۲۹۱)

۸، (اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، نیلم فرزانہ، براون پبلی کیشنز نئی دہلی، ص ۔۲۴۳)

۹، (9) (india wins freedom,Abul kalam Azad ,PDF, p.no 176۔

۱۰، (بحوالہ: مقدمہ ناول آنگن، عبدالحق حسرت, ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی۔ص ۔۱۸)

۱۱، (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی۔ص ۔۱۲۵)

۱۲، (اردو ناول کے اسالیب، شہاب ظفر اعظمی، تخلیق کار پبلی کیشنز۔ دہلی، ص ۔۱۷)

۱۳، (ایضاً، ص، ۱۳۲)

۱۴، (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ص، ۲۹)

۱۵، (ایضاً، ص، ۳۴)

۱۶، (ایضاً،ص،۱۶۵)

۱۷، (ایضاً،ص،۱۰۶)

۱۸، (اردوناول آزادی کے بعد،ڈاکٹر اسلم آزاد،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،ص۔۲۹۰)

۱۹، (آنگن،خدیجہ مستور،ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڑھ،خدیجہ مستور،ص۲۱۱)

۲۰، (ایضاً،ص،۲۱۴)

۲۱، (دیباچۂ آنگن۔احتشام حسین،ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڑھ،ص،۱۶)

۲۲، (فکروتحقیق،مدیر،پروفیسر علی کریم،اپریل۔جون،جلد۱۹،شمارہ۲،مئی،جولائی۔ص۔۲۰۰)

۲۳، (برصغیر میں اردوناول،ڈاکٹر خالداشرف،کتابی دنیا،دہلی،ص۔۲۱۶)

۲۴، (تانیثیت کے مباحث اوراردوناول،شبنم آرا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی،ص۔۲۳۲)

۲۵، (برِصغیر میں اردوناول،ڈاکٹر خالداشرف،کتابی دنیا،دہلی،ص،۲۱۸)

۲۶، (اردوناول پر تقسیمِ ہند کے المیے کے اثرات،ڈاکٹر محمد نسیم،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی، ص۔۱۴۶)

۲۷، (ایضاً،ص،۱۴۸)

۲۸، (خدیجہ مستور،زمینِ،کتاب والا،دہلی،ص۔۱۴)

۲۹، (تانیثیت کے مباحث اوراردوناول،شبنم آرا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،ص۔۲۳۰)

۳۰، (ردوناول پر تقسیمِ ہند کے المیہ کے اثرات،ڈاکٹر محمد نسیم،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی،ص۔۱۴۴)

۳۱، (ایضاً،ص۔۱۴۵)

۳۲، (تانیثیت کے مباحث اوراردوناول،شبنم آرا،ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس،دہلی،ص۔۲۳۱)

۳۳، (خدیجہ مستور،زمینِ،کتاب والا،دہلی،ص،۱۵۵)

۳۴، (تانیثیت کے مباحث اوراردوناول،۔شبنم آرا،ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس،دہلی،ص۔۲۳۱)

۳۵، (اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، نیلم فرزانہ، براون پبلی کیشنز نیہ دہلی، ص ۲۵۳)

۳۶، (خدیجہ مستور، زمینِ، کتاب والا، دہلی، ص، ص ۔۱)

۳۷، (خدیجہ مستور، زمینِ، کتاب والا، دہلی، ص، ۷۶)

۳۸، (خدیجہ مستور، زمینِ، کتاب والا، دہلی، ص، ۲۱۵)

۳۹، (اردو کی ناول نگار خواتین، ڈاکٹر سید جاوید اختر، ڈاکٹر سید جاوید اختر، بسمہ کتاب گھر دہلی، ص ۔۹۱)

۴۰، (ایضاً ۔ص، ۸۹)

باب دوم

اردو ناول میں تقسیمِ برصغیر کا المیہ: خواتین تخلیق کاروں کا عمومی جائزہ

تقسیمِ برصغیر کا واقع جنوبی ایشیا کی تاریخ کا ایک عظیم حادثہ تھا۔اس حادثے نے نہ صرف ہندو پاک اور موجودہ بنگلہ دیش پر سنگین اثرات مرتب کئے بلکہ اس حادثے نے معاصرین کی ہر ہر چیز پر اتنے گہرے نقوش ثبت کئے کہ ان کا جب موجودہ دور میں تذکرہ کیا جاتا ہے تو وہ چیزیں بھی اس دور کی سنگینیت کی سچی شہادت پیش کرنے سے قاصر نہیں رہتیں۔اس کی جلو میں رونما ہونے والے بدترین فسادات نے لاکھوں انسانوں کو معاشی ،معاشرتی ،اخلاقی اور نفسیاتی طور پر تباہی کی گہری کھائی میں جا ڈبویا۔مذہب کے نام پر لاکھوں لوگوں کو تہ تیغ کیا گیا،عورتوں کا استحصال کیا گیا،معصوم بچوں کو ابدی نیند سلایا گیا،ماؤں کی گودئیں اُجھاڑ دیں گئیں اور لوگوں کے صدیوں سے تعمیر شدہ آشیانے پل بھر میں آتشی شعلوں کی نذر کئے گئے۔فسادات نے تاریخ برصغیر میں ظلم و بربریت کی وہ خونین تاریخ رقم کی جس کی مثال ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی۔اس المیہ نے سماج سے جڑئے جملہ فنکاروں اور پیشہ وروں کو یکساں طور پر متاثر کیا جنہوں نے اس سانحہ کو خود جھیل کر اس کو فنی پیرائے میں برتا۔شاعروں نے اپنے شعروں کے ذریعے سے اس حادثے کا اظہار کیا،نثر نگاروں نے نثر کو وسیلۂ اظہار بناتے ہوئے اس موضوع کو نثری پیرائے میں سمیٹا ہے۔

واقعات کے بیان کے اعتبار سے اس دور کے ادیبوں میں خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن سب اس بات پر متفق ہیں کہ اس دور میں نظم و نثر دونوں میں اس موضوع کے تعلق سے کثرت سے لکھا گیا اور تخلیقی سفر کی اس دوڑ میں بلاشبہہ ناول اول درجہ پر ہے۔۱۹۴۷ء کے تقسیم کے عظیم حادثے نے ناول کو بہت متاثر کیا۔تاثیر کچھ ایسی تھی کہ ہر کوئی فنکار اس موضوع پر لکھنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پا رہا تھا ۔ناول نگاری کی تاریخ میں اتنے ناول کسی بھی دور میں منصۂ شہود پر نہیں آئے تھے جتنے اس دور میں آئے۔فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت پر متنوع ناول سامنے آئے زیادہ تر ناولوں کا موضوع وہ مختصر زمانہ رہا جس میں انسان نے جی بھر کے انسانی خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔اردو کی نثری اصناف میں ناول نگاری کو

اس تعلق سے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ تقسیم کے المیے کو جس حسن وخوبی سے اس صنف میں بیان کیا گیا ہے شاید کوئی اور صنف اتنی وسعت لانے میں قاصر ہی ہے۔ اس دور کے بعض ناول جذباتیت سے پر نظر آتے ہیں مثال کے طور پر (اور انسان مرگیا) رام انند ساگر، اور بعض مشترکہ تہذیبی اور تاریخی عناصر کو سامنے رکھ کر رقم کئے گئے ہیں جن میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے ناول نمایاں نظر آتے ہیں۔ جذباتیت طرز کے ناول عموماً پسند کئے گئے اور کہیں کہیں چھپ کر سامنے بھی آئے لیکن یہ بات اظہر منّ الشّمس ہے کہ ان کی مقبولیت ادبی ناولوں کے طور پر کم اور جذباتی ناولوں کے طور پر زیادہ ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مشترکہ تہذیبی اور تاریخی عناصر پر مبنی ناول بھی شہرت حاصل کرنے میں کامیاب رہے البتہ ان میں موضوع کے ساتھ ساتھ فنی لوازمات کی طرف بھی بھرپور توجہ دی گئی۔

تقسیم کے بعد ناول نگاری میں موضوع ومواد کے اعتبار سے خاصہ تنوع ہوا۔ فن کاروں نے متنوع موضوعات پر ناولوں کے ناول صفحۂ قرطاس پر بکھیر دئے۔ اس دور کے ناولوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ پاکستان کا وجود پذیر ہونا بھی اکثر تاریخی ناولوں کا موضوعِ بحث بنا۔ بعض ناول نگاروں نے گرچہ اخلاقی، نفسیاتی اور معاشرتی ناول بھی لکھے مگر حالات وواقعات کے اعتبار سے تقسیم اور پاکستان کا معرضِ وجود ہونا ہی اکثر ناولوں کا نقطہ نظر رہا۔ آزادی کے بعد ایک طرف جہاں اس دور کے سیاسی صورتحال کے تعلق سے ناول لکھے گئے، وہیں دوسری طرف پاکستانی حکومت کی بدعنوانیوں، معاشرتی بدحالیوں اور اخلاقی گراوٹ کو بھی بعض ناول نگاروں نے موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین نے آزادی کے بعد کے عہد کا تجزیہ اپنے ایک مضمون ''جدید اردو ناول کی تنقید'' میں کچھ یوں کیا ہے:

> ''اس پورے دور میں دو طرح کے ناول لکھے گئے ہیں ایک وہ جن میں کسی نہ کسی طرز سے معاشرتی کیفیات اور سماجی اور سیاسی صورتحال زیرِ بحث آئی ہے ان کا سلسلہ تقسیم ہندوستان یا اس سے قبل شروع ہو کر بنگلہ دیش سے ہوتا ہوا فسادات اور مختلف قسم کے مذہبی اور غیر مذہبی آویزشوں اور ٹکراؤ تک پہنچا ہے۔ دوسرے جن میں اقتدار کی شکست وریخت کا بیان ہے اور زور ان کے پسِ منظر یا سماجی محرکات پر نہیں ہے اور اس لحاظ سے دونوں ناولوں میں اندازِ بیاں اور کردار نگاری، واقع نگاری حتا کہ مکالموں تک کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔'' [1]

تقسیم سے چونکہ سماج کے جملہ انسان عمومی طور پر اور فن کار خصوصی طور پر متاثر ہوئے اس لئے بلا واسطہ یا براہِ راست ہر کسی نے اس المیے کا اظہار کسی نہ کسی طریقے سے کیا۔ تقسیمِ برصغیر کے اس المیہ کو ناول نگاروں کی ایک کثیر تعداد نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اس دور کے ناولوں میں انتظار حسین کا "بستی" اور "تذکرہ"، عبداللہ حسین کا "اُداس نسلیں"، حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول"، کرشن چندر کا "غدار"، نسیم حجازی کا ''خاک اور خون''، عبدالصمد کا "دوگز زمیں" اور "خوابوں کا سویرا"، قرۃ العین حیدر کا "میرے بھی صنم خانے"، سفینۂ غمِ دل، "آگ کا دریا" اور "آخرِ شب کے ہمسفر" خدیجہ مستور کا ''آنگن'' اور ''زمین''، جیلانی بانو کا ''ایوانِ غزل'' وغیرہ قابلِ ذکر ناول ہیں۔

مرد ادیبوں کی طرح ہی عورتوں نے بھی اس المیے کو بہ حسن وخوبی برتا ہے اور ادب کی جملہ اصناف کی طرح ناول نگاری میں بھی اپنا نام کمانے میں کامیاب ہوئیں۔ اردو ادب میں خواتین نے مردوں کے مقابلے میں بعد میں لکھنا شروع کیا اور ابتداء میں ان کے اس فعل کو مذہبی اور معاشرتی بُرائی قرار دیا جاتا تھا لیکن بہت کم وقت میں انہوں نے مردوں کے بنائے ہوئے حصار کو توڑ کر اپنے لئے راہ ہموار کی اور لکھنے کا قصد کر لیا۔ پہلے پہل انہوں نے فرضی ناموں سے اپنی تخلیقات شائع کیں یہاں تک کہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں انہوں نے باضابطہ طور پر اپنی تحریریں منصۂ شہود پر لانا شروع کیں۔ ابتداء میں ان کا زیادہ زور معاشرتی، اصلاحی اور سماجی مظالم کے خلاف رہا لیکن بدلتے حالات کے پیشِ نظر انہوں نے بھی اپنے موضوعات میں تبدیلیاں لائیں یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء تک آتے آتے ناول نگاری میں خواتین تخلیق کاروں کا بہت ادنیٰ ہی صحیح لیکن قابلِ قدر ذخیرہ جمع ہو گیا، جو مستقبل کی خواتین تخلیق کاروں کے لیے باعثِ تحریک ثابت ہوا۔

تقسیمِ ملک سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کا زمانہ اردو ناول کی مقبولیت کا زمانہ ہے اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اس زمانہ میں سب سے زیادہ ناول تخلیق کیے گئے۔ چونکہ اس زمانے میں برِصغیر کی تاریخ کا عظیم حادثہ رونما ہوا جس نے برصغیر کے نقشے پر مذہب کے نام پر ایک نئے ملک کا اضافہ کیا۔ اس المیہ کے پیشِ نظر مرد وزن تخلیق کاروں کی ایک نئی کھیپ سامنے آ گئی۔ اس حادثے نے جہاں ایک طرف نئے مرد ناول نگاروں کو متعارف کرایا وہیں اس نے خواتین تخلیق کاروں کی ایک کھیپ سامنے لا کھڑی کر دی جنھوں نے

اس المیہ کوخود سہا اور اُس پیرائے میں برتا کہ جس کواس سے پہلے سماج سے جڑے مرد حضرات پیش کرنے سے آجز نظر آرہے تھے۔عورتوں نے اس سلگتے ہوئے موضوع پر ہوشربہ ناول صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیئے جنہوں نے ہرسوں مشہوریت اور پذیرائی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔عورتوں نے اس طرز کے اکثر ناولوں میں حقیقت بیانی کی وہ مثالیں قائم کیں ہیں جو تاریخ میں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتیں۔

تقسیمِ برصغیر کے المیہ میں چونکہ عورتوں کو ہی سب سے زیادہ جھیلنا پڑا اور تاریخ کے سیاہ ترین واقعات سے سابقہ پڑا۔اس لئے یہ بات اس تناظر میں مبالغہ آرائی کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ خواتین ناول نگاروں نے اس المیہ کو جس حسن وخوبی اور دردمندانہ لہجے سے بیان کیا ہے اُس چیز میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ہجرت اور قیامِ پاکستان جیسے واقعات اور دونوں اطراف سے کئے گئے مظالم بھی خواتین تخلیق کاروں نے کمہ حقہ حقائق کی بنیاد پر ہی اپنی تخلیقوں میں سموئے ہے۔تقسیمِ ملک کے دوران عورتوں پر مردوں نے جو ظلم وتشدد کی یلغار بپا کی ان انسان سوز اور حیا سوز واقعات کی پیشکش بھی خواتین تخلیق کاروں نے احسن طریقے سے اپنی تخلیقات میں کی ہے۔

تقسیم کے المیہ کے ساتھ ساتھ اس دور کی خواتین تخلیق کاروں نے عورتوں کے تعلیمی،معاشرتی،معاشی اور اقتصادی وغیرہ سطح پر معاشرے میں عورت کی پسند دیدگی کے اسباب کو بھی اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے اور یہ کوشش بھی بہت حد تک کامیاب نظر آتی ہے۔متذکرہ فن کاروں میں سے ہرکسی فنکارہ نے تقسیم کی ہولنا کیوں کا ذکر بڑی غیر جانبداری اور دردمندی سے کیا ہے۔خون،دہشت اور آگ کے مناظر ہیں،گھروں کے لٹنے کی تصویریں ہیں،بے گناہوں کے قتلِ عام کے مناظر بھی جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔تقسیم کا واقعہ کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے جان لیویٰ اور نقصان دہ ثابت ہوا اس کی پیشکش بھی ملتی ہے۔مسلم آبادی والے علاقے کیسے ہندوؤں کی بے حرمتی اور بے کسی دیکھتے ہیں اور ہندو آبادی والے علاقوں میں کیسے مسلمان ظلم وستم اور ہندوؤں کی سفاکی کا شکار ہوتے ہیں اس کی تصویر بھی خوب دیکھنے کو ملتی ہے۔اس دور کے عام فن کاروں میں عمومی طور پر اور خواتین تخلیق کاروں میں خصوصی طور پر مہاجروں کی دردانگیز کہانیاں ہیں ان مہاجرین نے جو چوٹیں کھائیں تھیں انہوں نے جو اپنے رفیقوں کو کھویا تھا اس کا برملا اظہار ان کی تخلیقوں میں ملتا ہے۔ان کی عورتیں اغوا کرلیں گئیں تھیں،ان

کے خاندان گھٹ گئے تھے،ان کے لئے زمین اجنبی تھی اور اجنبیت کا احساس ان کے جانکاہ تھا۔ یہ لوگ غم سے نڈھال ہو چکے تھے ان کی آنکھوں کا پانی خشک ہو چکا تھا،ان کے لئے ماتم بے کار تھا،ان کا درد حد سے تجاوز کر کے دوا بن گیا تھا۔ یہ حالات ان تمام انسانوں کے تھے جنھوں نے اس دور میں جینے کا گناہ کیا تھا۔خواہ وہ ہندوٗ تھے یا مسلمان۔ اُن پر ظلم وستم صرف اس لئے کئے جا رہے تھے کیونکہ انہوں نے اُس دور میں جینے کا گناہ کیا تھا جس دور میں انسان اشرفیت کے مقام سے گر کر حیوانیت کے مقام پر پہنچ گئی تھی۔ مذکورہ تمام حالات وواقعات کوعورت تخلیق کاروں نے اپنے ناولوں میں احسن طریقے سے پرویا ہے جس سے اس دور کی پوری تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھیر جاتی ہے۔

تقسیم کے اس المیے کو جن خواتین تخلیق کاروں نے حقائق کی روشنی میں درد وکرب سے بیاں کیا ہے ان میں قرۃالعین حیدر، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور حال کی ناول نگاروں میں رضیہ بھٹ جیسے فن کار قابلِ ذکر ہیں۔ جنہوں نے اس المیہ کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر کر اس کے حقائق کو جان کر فکشن کے رنگ میں پرو کر اس المیہ کی سنگینیت کوعیاں کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس المیہ کے وہ نکات سامنے آئے ہیں جن تک عام انسان کی شاید ہی آنکھ جا سکتی ہو۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ حقائق کو فکشن میں اُتارنے سے بحث والی چیز کی صحیح تصویر دھندلی پڑھ جاتی ہے لیکن یہاں پر ہمیں ویسا کچھ دکھائی نہیں دیتا بلکہ سکے کے دونوں رُخ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہوں نے حقائق کو فکشن کے روپ میں پرو کر حقائق کی اور بھی صحیح طریقے سے تصویر کشی کی ہے نہ کہ حقائق سے آنکھ چرا کر صرف فن کاری کی جلوہ گری تک محدود رہے ہیں۔

جیلانی بانو:"ایوانِ غزل" ۔

پدم شری انعام یافتہ ناول نگار ُجیلانی بانو' تقسیم کے بعد اُبھرنے والے ناول نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی دل و جان سے خدمات انجام دی ہیں اور بہت سارے نئے اور مؤثر فن پاروں سے اردو کی سرزمین کو سیراب کیا ہے۔ 'ایوانِ غزل' موصوفہ کا ایک ایسا ناول ہے جس نے اردو کے معدودِ چند ناولوں میں اپنا نام شمار کروایا ہے۔ اس ناول میں موصوفہ نے حیدرآباد کی سماجی، ثقافتی اور طبقاتی زندگی کو تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد ادوار میں پیش کرنے کی احسن سعی کی ہے اور ایک تہذیبی دور کے زوال کی عکاسی کی ہے۔ جس کی پیشکش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئی

ہے۔موصوفہ نے اس ناول میں دو مختلف خاندانوں کو'الف لیلیٰ' اور'ایوانِ غزل' کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔'الف لیلیٰ' خاندان میں توہمات اور مذہبی رسوم کی پابندی مسکین علی شاہ طوطا چشمی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ وہاں حیدرعلی خان اوراس کی بیگم بشیرہ بیگم ہیں جومغربی تہذیب کے شیدائی ہیں۔یہ آزاد خیال لوگوں کا خاندان ہے، یہ لوگ اخلاقیات اور مذہبی عقائد سے دور ہیں۔یہ لوگ شراب نوشی،کلب لائف،نیم عریاں لباس پہننا اور اخلاق باختہ چیزوں کو جدید طرزِ زندگی قرار دیتے ہیں۔'الف لیلیٰ' کے مقابلے میں دوسرا خاندان 'ایوانِ غزل' ہے اس خاندان میں وہ سارے کردار جمع کئے گئے ہیں جو جا گیردارانہ نظام سے منسلک ہیں اور ماضی کی مٹتی ہوئی قدروں کی آخری نشانی ہیں۔اس طرز کے کرداروں میں جیلانی بانو نے واحد حسین اور احمد حسین جیسے کرداروں کو خلق کیا ہے۔وہ گردوپیش کی دنیا میں بدلتے حالات سے بے خبر، حسن پرستی،عیاشی،شعروشاعری اور ظاہرداری کو پیش کرتے ہیں۔

۳۸۳ صفات پر پھیلا جیلانی بانو کا یہ ضخیم ناول دراصل تقسیم کے پسِ منظر اور پیشِ منظر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔یہ ناول تقسیم سے پہلے کے حالات وواقعات سے شروع ہوتا ہوا آزادی کے چند برسوں بعد تک کے معاملات کی پیشکش پر اختتام پذیر ہوا ہے۔ناول میں مرکزی توجہ نظام حیدرآباد، تلنگانہ تحریک کے خلاف انڈین ملٹری ایکشن اور وہاں کی معاشرتی زندگی پر کی گئی ہے۔مصنفہ کا یہ ناول تقسیم کے بعد لکھے جانے والے ان معدودِ چند ناولوں میں سے ایک ناول ہے جن میں سقوطِ حیدرآباد کے تناظر میں تقسیم ہند کے المیے کو پیش کیا گیا ہے۔موصوفہ نے بڑے ہی ماہرانہ پیرائے اظہار میں حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کے زوال کی روداد وسیع مشاہدے کی بنیاد پر بیان کی ہے۔اس دور کے مزدور طبقہ کے انقلابی عزم کو بھی پیش کیا ہے جو آزادی کے بعد حیدرآباد کے گرد بادلوں کی طرح منڈھلانے لگا تھا۔موصوفہ نے اس حوالے سے سماج میں ہر طرح کے ظلم وجبر کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔

ناول کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ناول بہت سارے کرداروں پر مشتمل ہے۔جن میں جنس ونسل کی تفریق کے بغیر ہر کوئی کردار اس دور کی کسی نہ کسی طریقے سے نمائندگی کرتا دکھایا گیا ہے۔واحد حسین، راشد، چاند،غزل، قیصر، سنجیوا،مسکین علی شاہ طوطا چشمی، بیرسٹر حیدرعلی خاں، شینو،اور ہمایوں قابلِ ذکر کردار ہیں۔واحد حسین حیدرآباد کے رئیس کا بیٹا ہے،شعروشاعری کا ذوق ورثے میں ملا

ہے۔گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا اس کو خوب آتا ہے۔زوال کے بعد اب تحصیلداری کی نوکری کرتا ہے۔

> ''واحد حسین کے دادا پائیگاں سے تعلق رکھتے تھے اور ان صاحبِ اقتدار لوگوں میں سے تھے جن کی اپنی فوج اور پولیس تک تھی۔اس وقت نہ تو ریذیڈنٹ کا ڈنڈا سر پر آیا تھا اور نہ خود حضور اعلیٰ کو اتنا اختیار تھا کہ پائیگاں والوں سے کوئی باز پرس ہوتی۔ایسے میں موج اڑانا صرف واحد حسین کے باپ دادا کی میراث تھی۔اس لئے انہوں نے ایوانِ غزل بنایا اور اس میں ہر زمانے کے مطابق ایک نیا معشوق جلوہ گر ہے''۔ [۲]

راشد اس کا بیٹا ہے جس کی شادی مشہور تاجر کی لڑکی رضیہ سے کر دی گئی ہوتی ہے۔حیدر علی ترقی پسندی کے دلدادہ ہیں۔چاند اس کی بیٹی ہے اور وہ اس کی پرورش بھی اسی طرز پر کرتے ہیں،اس کو میڈیکل کی تعلیم دے کر اُس کو اِس ماحول کے لئے سازگار بنایا جاتا ہے۔مسکین علی شاہ کے گھرانے کے ذریعے سے مصنفہ نے نام نہاد مرشدی گھرانے میں چلنے والے اُس گورکھ دھندے کو بے نقاب کیا ہے جہاں خواتین کی عزت و اہمیت کی قدر نہیں۔'غزل' اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔وہ ہمایوں اور بتول بیگم کی بیٹی،واحد حسین کی نواسی اور مسکین علی شاہ طوطا چشمی کی پوتی ہے۔اس کی شخصیت پر'چاند' کے اثرات پڑے ہیں۔یکے بعد دیگرے نصیر،سرور،بھان سب اس سے اظہارِ محبت کرتے ہیں مگر شادی کوئی نہیں کرتا۔نصیر دس سال کے بعد شادی کر کے اس کے پاس آ کے اس کے ہاتھ سے اپنی دی ہوئی آنگھوٹی واپس لے جاتا ہے جس کے سہارے سے غزل جدائی کے دس سال گذار رہی ہوتی ہے۔نصیر کی بیوفائی کی وجہ سے وہ خود کشی کر لیتی ہے اور اپنی موت کا ذمہ دار خود کو قرار دیتی ہے۔

ناول کی کہانی کو'جیلانی بانو' نے omniscient Narrator (واحد متکلم) کی زبانی بیان کیا ہے۔موصوفہ نے ناول کی ابتداء آزادی کے بعد والے ایک سیمینار کے منظر سے کی ہے جو اردو شاعری کی ایک اہم صنف غزل پر ہو رہا تھا۔سیمینار میں ملک کے بڑے بڑے لیڈر قومی یکجہتی کا ثبوت دینے کے لئے حاضر ہوتے دکھائے گئے ہیں۔موصوفہ ناول کی ابتداء اور درمیان میں وقتاً فوقتاً 'ایوانِ غزل' کے غزل گو شعرا اور صنفِ غزل کا ذکر کر کے ناول کے مرکزی کردار'غزل' اور صنفِ غزل کے درمیان مشابہت کے

ذریعے علامتی فضا قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

'ایوانِ غزل' فنی اور موضوعاتی اعتبار سے موصوفہ کا ایک کامیاب ناول ہے۔ ناول میں واقعات کی مناسبت سے کرداروں کی مؤثر پیشکش ہوئی ہے۔ تمام کرداروں کے ذریعے سے متعلقہ عہد کی تغیر پذیر صورتِ حال کی حقیقت پسندانہ ترجمانی کی گئی ہے۔ ناول کا پلاٹ صاف اور سادہ ہے۔ مکالمے موقع ومحل کے حساب سے ہیں جس سے موصوفہ کی گہری علمی بصیرت بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ موصوفہ نے پلاٹ کی تعمیر کے سلسلے میں واقعات کی تراش خراش اس انداز میں کی ہے کہ قصے کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے اور حقیقت نگاری بھی متاثر نہیں ہوتی۔

تقسیم کے المیہ کے بعد فکشن کے میدان میں بہت سارے نئے نام اُبھر کر سامنے آیئے جنہوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے فکشن میں ایک الگ شناخت قائم کی۔ اس نسل میں جیلانی بانو کا نام بہت زاویوں سے اہم اور قابلِ مطالعہ ہے وہ ایک عرصے سے فکشن میں اپنے جلوئے بکھیر رہی ہے۔ نصف صدی سے چلتے اپنے تخلیقی سفر میں انہوں نے اردو ادب کی بہت خدمات انجام دیں ہیں۔ ابھی تک کے ادبی سفر میں انہوں نے دو ناول، دو ناولٹ، دس افسانوی مجموعوں کے علاوہ تراجم کے ذریعے سے اردو فکشن میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ وہ گہرے شعور، وسیع احساسِ معروضی، وسیع مشاہدے اور فنی تنوع کی بنا پر ایسے ایسے معرکے تراشتی ہے کہ بات اپنے پورے پسِ منظر اور پیشِ منظر کو عیاں کرتی ہوئی روزِ تاباں کی طرح مثالی بن جاتی ہے۔

جیلانی بانو کو اردو ادب میں ایک اہم فکشن نگار تصور کیا جاتا ہے جنہوں نے فرضی دنیا کے خیالی واقعات کے بجائے حقایق پر مبنی واقعات وحادثات کو اپنے فن پاروں میں جگہ دی ہے اسی حقیقت پسندانہ مزاج کو قائم رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے ناولوں کو حقیقت کا آئینہ دار بنایا ہے جو موضوع اور فن دونوں اعتبار سے اردو ناول میں ایک قابل تحسین اضافہ ہے۔ ایوانِ غزل موصوفہ کا وہ ناول ہے جس نے ان کو جیتے جی حیاتِ جاوید عطا کی ہے۔ اس ناول میں موصوفہ نے حیدرآباد کے سکوت کے تناظر میں تقسیم ہند کے المیے کو پیش کیا ہے۔ زوالِ حیدرآباد کی جو تصویر تاریخی وتہذیبی طور پر انہوں نے منظرِ عام پر لائی ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے۔ اس ناول میں انہوں نے حیدرآباد کی وہ صاف وشفاف تصویر سامنے لائی ہے جو

اپنی مثال آپ ہے۔ ناول کو پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوفہ افسانہ نگاری کے میدان میں قابلِ قدر معرکے تراشنے کے بعد ناول نگاری کے میدان میں محنتِ شاقہ کر کے اس صنفِ ادب کو بھی اپنے فکر و عمل کی جولانی اور کاوشوں سے نوازنے کا قصد کر کے آئی ہے۔ اپنی فکر کی اشاعت کے لئے انہوں نے ہمہ گیر موضوع کا انتخاب کیا جو حیدرآباد کی سماجی و ثقافتی اور سیاسی صورتحال کا موضوع تھا۔ اس میں حکمران طبقے کا غلام طبقے کو ظلمت و اندھیرے میں رکھنا خاص پہلو رہا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد جاگیردارانہ نظام اور اس کے کارندوں کو جن چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا، مصنفہ نے بہ حسن و خوبی پورے فن کارانہ پیرائے میں اسی چیز کی وضاحت کی ہے۔

ناول میں فن کار نے اپنے وسیع مطالعہ، وسیع مشاہدہ اور گہری ذہنی اپج کے بلبوتے پر حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کے زوال کی روداد احسن طریقے سے بیان کی ہے۔ موصوفہ نے صدیوں کی تہذیب و تمدن کے زوال کا مشاہدہ کرتے ہوئے جذباتیت کے بجائے عقلیت سے کام لیا اور ان حقائق کا برملا اظہار کیا ہے جن کا سامنا آزادی کے بعد عوام اور حکمران طبقے کو کرنا پڑا۔ حکمرانوں کی عیاشیاں اور رعایا کے تئیں ان کا لاپرواہی بھرا سلوک آخر کار کس طرح ایک عظیم سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیتا ہے اس چیز کی منظر کشی ''انور خان'' نے کچھ یوں کی ہے:

> "ناول ''ایوانِ غزل'' کی علامت اختتام پر ماضی کی ایک شاندار تہذیب کے انہدام کے استعارے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ وقت کے بے قابو اور بے روک ٹوک سفر میں تہذیب کے درخت کا اپنا ایک فطری حیاتیاتی نظام کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس پر دردناک تبدیلیوں کی خزاں بھی آتی ہے۔ اس کے پتے جڑنے لگتے ہیں لیکن کائنات کے اس رسہ خیزی میں نئے پتے دوسرے مختلف رنگوں میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔'' [۳]

ناول ''ایوانِ غزل'' میں جیلانی بانو نے دراصل بہت سارے کرداروں کے ذریعے سے اس بات کو سامنے لانے کی سعی کی ہے کہ حیدرآباد جو کہ انگریزوں کے دور میں ایک خود مختار ریاست تھی جدوجہد آزادی کے ساتھ کھڑی نہیں تھی۔ وہاں کے امراء اور جاگیردار متحدہ ہند کی آزادی کے شانہ بہ شانہ اس لئے نہیں تھے

کیونکہ ان کو اس بات کا بہ خوبی علم تھا کہ انگریزوں کی غلامی میں ہی ہماری شاہی ہے اور متحدہ ہند کی آزادی میں ہماری گدائی ورسوائی ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے طور سے اپنے مقام و مرتبے کو بچانے کے لئے بارہا جتن کئے، یہاں تک کہ انگریزوں کے حمائتی بھی بن گئے۔ جاگیرداروں اور نوابوں کے ساتھ ساتھ متحدہ ہند کے بہت سارے امراء انگریزوں کی غلامی میں ہی خوش تھے چند سیاسی جماعتیں ہی اس حوالے سے فعال کردار ادا کر رہی تھیں جن میں کانگریس اور مسلم لیگ سرِ فہرست تھیں۔ اگرچہ ان کے آپس میں نظریاتی اختلافات بھی تھے مگر اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ یہ دونوں جماعتیں متحد ہند کی آزادی میں پیش پیش نہ تھیں۔ موصوفہ نے آزادی سے پہلے کی مشترکہ تہذیب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''چیچک کی وبا پھیلتی تھی تو مسلمان عورتیں دیوی پر چڑھاوا چڑھاتی تھیں اور درگاہوں کے عرس میں ہندوؤں کی جانب سے نذر کے خوان آتے......... رمضان میں ہندوؤں کے ہاں سے مسجد میں افطاری بھیجی جاتی تھی۔'' [۴]

لیکن حالات بدلتے دیر نہ ہوئی۔ متحدہ ہند میں جہاں لوگ آپس میں مشترکہ تہذیب کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے اور لوگوں کی زندگیوں میں بیش بہا خوشیاں اور مسرت بھری ہوئیں تھیں وہیں پر آزادی ان تمام خوشیوں اور شادمانیوں کے لیے اک ڈراؤنا خواب (Nightmare) بن کر سامنے آ گئی۔ برصغیر کی تقسیم کا المیہ ہر کسی فرد کے دل کے اندر ایک گہرا زخم چھوڑ گیا جس کا مرہم شاید آگے آنے والی نسلیں بھی پُر کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی وجہ سے ہر سمت خون کی ندیاں جاری ہوئیں، ہر گھر ماتم کدہ بن گیا، روایات و مشترکہ ملی وراثت کا تہہ راج کیا گیا، مذہبی جنونیت کا دور دورہ شروع ہوا اور ہر طرف بدامنی اور خوف و ہراس کا بازار گرم ہوا۔ مصنفہ اس حوالے سے ناول میں لکھتی ہیں:

> ''ہر گھر سے چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ عورتیں اپنی چھتوں پر کھڑی ننھے سپاہیوں کو پکار رہی تھیں جو بندوقیں تھامنا نہیں جانتے تھے مگر چند مفاد پرستوں نے ان کے ہاتھ میں جذبات کی لاٹھی تھما دی تھی۔ ہزاروں نوجوانوں کی لاشیں پیڑوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ چٹانوں پر بکھری پڑی تھیں۔ ندیوں میں تیر رہیں تھیں۔ ان کی کھلی ہوئی

ساکت آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔ہم کس لئے لڑے۔'' [۵]

برصغیر کی تقسیم کا اثر حیدرآباد کی ریاست پر بھی برابر پڑا، وہاں پر اگرچہ برصغیر کے باقی حصوں کے مقابلے میں دیر سے ہی آپسی منافرت اور قتل وغارتگری کا دور دورہ شروع ہوا لیکن آخرِ کار وہاں پر بھی اسی شدت اور زور سے حالات بگڑ گئے جس طرح باقی حصوں میں اس سے پہلے بگڑے تھے۔ موصوفہ نے انہی حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے پہلے برسہ برس سے مروج، مشترکہ تہذیب اور آپسی بھائی چارے کی طرف ہماری توجہ مبزول کرائی ہے جہاں پر ہر کسی مذہب کا ماننے والا بلا کسی تردد و پریشانی کے باقی مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گذار لیتا تھا۔لوگ انسانیت کی ڈور میں بندھے ہوئے تھے اور ہر دم کسی بھی قربانی کے لئے تیار رہتے تھے لیکن انگریزوں کی ہندوستان میں آمد نے ان تمام روایات کا قلع قمع کیا۔انہوں نے پہلے بہت ساری پالیسیاں اپنا کے یہاں کے مقامی لوگوں کے درمیان نفرتوں اور عداوتوں کی دیوار کھڑی کر دی پھر پورے زور سے یہاں کے اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کر دیا اور اپنی کامیابیوں کے در کھولے۔مقامی لوگوں کو آپس میں لڑا کر گویا 'دوسرے کی لڑائی، تیسرے کی جیت' کے مفروضے کے مترادف اپنی کامیابی پکی کر دی۔شہروں کے شہر اس خونین کھیل میں تباہ و برباد ہو گئے جو کبھی امن وسکون کے گہوارے تصور کئے جاتے تھے۔حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے اس تناظر میں وہ اپنے ناول 'ایوانِ غزل' میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''سارے شہر میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔پھر سامنے خادم علی بیگ کے بنگلے پر ایک ٹرک آکر رکا اور اس میں گھر کا قیمتی سامان رکھا جانے لگا۔لوگ کہہ رہے تھے کہ خادم علی بیگ نے بمبئی سے ایک ڈیکوٹا طیارہ حاصل کر لیا ہے۔جو انہیں حفاظت کے ساتھ پاکستان لے جائے گا۔
> یہ وہی خادم علی بیگ تھے جنہوں نے اتحادالمسلمین کے جلسوں میں قوم کو اپنا آخری قطرۂ خون بہانے کی تعلیم دی تھی۔ماؤں اور بیبیوں کے آگے گڑگڑائے تھے کہ مادرِ وطن قربانی چاہتی ہے۔'' [۶]

یعنی تقسیمِ برصغیر کے ساتھ ہی سقوطِ حیدرآباد کا عمل بھی ہوا اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ میں یہاں سے مسلمانوں کا انخلاح بھی شروع ہوا۔موصوفہ نے اس چیز کو اپنی فنی صلاحیتوں اور کاوشوں سے بڑے ہی

غیر جانبدارانہ انداز میں نبھایا ہے، پہلے مسلمان حاکموں کی عیش کوشی اور آرام پسندی کا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد فرقہ واریت پر افسانوی انداز میں بحث کیا ہے اور اس کے بعد تقسیم کے المناک واقعات پر اس ناول کا اختتام کیا ہے۔ آخر پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ موصوفہ کا متذکرہ ناول تقسیم کے پسِ منظر اور پیشِ منظر پر لکھا ہوا ایک منفرد اور اہم ناول ہے جس نے اردو ادب میں اپنے موضوع و مواد کے حوالے سے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔

قرۃ العین حیدر اور تقسیمِ برصغیر کا المیہ:

تقسیمِ برصغیر کے المیے پر جہاں ناول نگاروں کی ایک کثیر تعداد نے بہت بڑے اور مؤثر ناول لکھے ہیں جن میں مرد و زن دونوں یکساں شمار ہوتے ہیں۔ ان ہی فن کاروں میں ایک نام قرۃ العین حیدر کا بھی ہے جو بلا کسی تعرض اور مبالغہ آرائی کے ان میں سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے جہاں ایک طرف سماج سے منسلک بہت سارے موضوعات کو اپنے ناولوں کے لئے منتخب کیا وہیں اس نے تقسیمِ برصغیر کے موضوع پر ناول لکھ کر اس میں قابلِ قدر اضافہ کے ساتھ ساتھ اس موضوع کے اچھوتے پہلوں کو بھی اپنی فنکارانہ مہارت سے عیاں اور اپنے موثر طرزِ تحریر کے بنا پر تقسیم کے ساتھ منسلک موضوعات کو اُجاگر کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنا ادبی سفر اپنے والد کی صحبت میں افسانہ نگاری سے شروع کیا مگر اس میدان میں ان کی طبعیت کچھ راس نہ آئی اور ناول نگاری میں قدم ڈالتے ہی اس کو آسماں کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ یوں تو ان کی ساری کہانیاں اہمیت کی حامل ہیں جن میں 'میرے بھی صنم خانے'، 'سفینۂ غمِ دل'، 'آگ کا دریا'، 'آخرِ شب کے ہمسفر'، 'کارِ جہاں دراز ہے'، 'گردشِ رنگِ چمن' اور 'چاندنی بیگم' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مگر ان میں 'میرے بھی صنم خانے'، 'سفینۂ غمِ دل'، 'آگ کا دریا' اور 'آخرِ شب کے ہمسفر' ہی ایسے ناول ہیں جن میں موصوفہ نے تقسیمِ برصغیر کے المیے کو گہرے سیاسی اور سماجی شعور اور پوری فنی بصیرت کے ساتھ برتا ہے۔ موصوفہ اس تاریخ، تہذیب اور سماج کی نمایندہ تخلیق کار تھیں جس سے عہدِ حاضر کے لوگ سِرے سے ہی محروم ہوتے جا رہے ہیں انہوں نے برصغیر کے اقدار، تہذیب اور جذبات و احساسات کی مٹی سے اپنے کرداروں کو ایک صحیح سانچے میں ڈالا اور ان کو ہر کسی کے لئے پُرکشش بنایا، اتنا پُرکشش کہ ان کو پڑھ کر

ہر کسی کو ان میں اپنائیت جھلکتی نظر آتی ہے۔

میرے بھی صنم خانے ،(قرۃ العین حیدر):۔

’ میرے بھی صنم خانے‘ قرۃ العین حیدر کا ایک شاہکار ناول ہے۔موصوفہ نے یہ ناول ایم۔اے کے دوران ۱۹۴۷ء میں لکھا اور ۱۹۴۹ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔اس ناول میں موصوفہ نے اودھ کے زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرے کی مٹتی ہوئی تہذیبی اقدار اور سماج کی صورتحال ’شعور کی رو‘ تکنیک کے ذریعے انجام دی ہے۔اس ناول میں اودھ کی اس مشترکہ تہذیبی وراثت کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے جس کی روایت صدیوں سے قائم تھی اور جس تہذیب کو تقسیمِ برصغیر نے پارہ پارہ کر دیا۔موصوفہ چونکہ مشترکہ تہذیب کی خود حامی تھی اس لئے تقسیم کے حوالے سے ان کا جھکاو ہمیشہ مخالفانہ رہا،جس کی جلواہ گری موصوفہ نے اپنے پہلے ہی ناول میں دکھائی ۔موصوفہ نے اس پہلے ہی تجربے میں اس کرب کو بڑے ہی فنکارانہ پیرائے میں قارئین کے سامنے لایا ہے۔یہ موصوفہ کا پہلا ناول ہے لیکن اپنی فنی خصوصیات سے یہ ناول آج بھی اردو کے چند بڑے ناولوں میں سے شمار کیا جاتا ہے۔موصوفہ اس ناول کے تعلق سے خود لکھتی ہے :

> "۱۹۴۷" ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی والد کے انتقال کے بعد یہ میرے لئے دوسرا زبردست ذہنی اور جذباتی حادثہ تھا۔میں نے افسانے ۱۹۴۴ء میں لکھنے شروع کر دیئے تھے۔تقسیمِ ہند کے صدمے نے ۱۹۴۴ء (کذا)(یہ غالباً کتابت کی غلطی ہے اسلئے کہ ’میرئے بھی صنم خانے‘ کے آخر میں دلکشا لکھنو دسمبر ۱۹۴۷ء مندرج ہے) کے آخر میں ساڑھے انیس سال کی عمر میں ’’مجھ سے میرے بھی صنم خانے‘‘ لکھوایا جو میرا پہلا ناول تھا اور جسے آج بھی اردو کے چند اچھے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس کے بعد جو کچھ لکھا اس صدمے کے زیرِ اثر لکھا۔‘‘ [۷]

یہ ناول فنی اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔ناول کا موضوع ،اسلوب ،تکنیک ،کردار نگاری اور مکالمہ نگاری وغیرہ سب اجزا قابلِ تقلید ہیں اور موصوفہ کے فنی کمال کا بات بات پر ثبوت پیش کرتے ہیں ۔ناول کو موصوفہ نے یوں تو بہت سارے کرداروں سے مزین و آراستہ کیا ہے لیکن یہاں پر ان ہی

کرداروں کا تذکرہ کیا جائے گا جو تقسیمِ برصغیر کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔

عینی نے ناول کو کنور عرفان علی خان کے ذریعے سے آگے بڑھایا ہے۔ جو کہ کرواہاروج کا جاگیر دار ہوتا ہے۔ سارے خاندان کے ساتھ ساتھ ان کا قیام بھی 'غفران منزل' میں ہوتا ہے۔ ناول کے دوسرے کرداروں میں کنور رانی، سلطنت آرا بیگم، کنور عرفان کی اہلیہ ہے جو کہ کنور عرفان علی خان کے انتقال ہو جانے کے بعد چودھری شمیم سے نکاح کرتی ہے۔ پولو کنور ناول میں عرفان علی کا بڑا بیٹا ہے جو ایک کاہل اور آلسی طبعیت کا راجکمار ہوتا ہے۔ چھوٹا بیٹا پی چو مقابلہ جاتی امتحان کے ذریعہ سے ایک اعلیٰ پولیس عہدیدار بن جاتا ہے اور اپنے خلوص اور محنت سے متحدہ ہند کا ایک پاسباں سپاہی بن جاتا ہے۔ عباسی خانم غفران منزل کی ایک مغلانی ہے اور لالہ اقبال نرائین کرواہاراج کا منیجر ہے۔ کنور عرفان علی خان کی ایک اکلوتی بیٹی رخشندہ عرف روشی اس ناول کی مرکزی کردار ہے۔ ناول نگار نے دراصل مرکزی کردار رخشندہ کے ذریعے سے اپنے عہد کے سب سے بڑے سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلاب یعنی تقسیمِ برصغیر کے المیے کو منفرد اندازِ بیاں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ مغربی تعلیم سے آراستہ بھی ہے دوسرا فنونِ جدیدہ یعنی میوزک، پینٹنگ، ڈانس پر کامل عبور تھا۔ وہ اس ناول کی ایک بیحد فعال کردار ہے۔ اسے سیاست سے دلچسپی اور کانگریس کے نظرئے کی حامی ہوتی ہے۔ اپنے نظریئے کی ترجمانی کے لئے وہ 'نیوا ایرا' نام کا ایک انگریزی رسالہ نکالتی ہے۔ ملک سے محبت اور انسیت کے پیشِ نظر اپنے رسالہ میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں کرتی اور اپنی روش پر ڈٹی رہتی ہے۔ ذیل کی عبارت اس کی دلیری، مصمم ارادے اور بہادری کی دلالت کرتے ہیں، جب اس کا بھائی 'پی چو' اس کو مضمون کی ایک عبارت میں ترمیم کرنے کے لئے کہتا ہے:۔

> "لیکن روشی ہمیں ''نیوا ایرا'' کی پالیسی میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ میاں کی خاطر اور کرواہاراج کی خاطر۔۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو پی چو۔۔۔''نیوا ایرا'' کی پالیسی میں تبدیلی۔۔۔؟ رخشندہ نے آنکھیں پوری طرح کھول کر کہا۔''[۸]

اختلاف کے باوجود بھی رخشندہ اپنے خونی رشتے کا پاس و لحاظ رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے اور فسادات کے دوران 'پی چو' کے اپنے ہی نظریئے کے لوگوں کے حامیوں کے ہاتھوں موت کے بعد وہ اسے کرفیو کے سناٹے میں اسے جس درد اور کرب سے ڈھونڈھتی ہے۔ یہاں تک کہ ہر جا چھان مارتی ہے

لیکن وہ کہیں نہیں ملتا آخرِ کار غفران منزل کی طرف رخ کرتی ہے لیکن حکومت وقت کی پابندیوں کی وجہ سے وہاں نہیں جا پاتی اور اس طریقے سے رخشندہ گویا اپنے ہی محبّ وطن میں انجان اور مہاجر بن جاتی ہے اس کی قوم کے تئیں وہ محنت اور قربانیوں کا صلہ کچھ اس طرح سے دیا جاتا ہے کہ وہ جیتے جی مردہ ہو جاتی ہے۔ دراصل قرۃ العین حیدر نے پی چو اور رخشندہ کے ذریعے سے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ تقسیم کے المیے میں لوگوں کی آنکھوں پر اس حد تک جہالت کے پردے حائل ہوئے تھے کہ ان کو اپنوں اور پرائیوں میں فرق نظر آ نہیں رہا تھا ان کو یہ تک نظر نہیں آ رہا تھا کہ ملک کے لئے جو لوگ خیر خواہ ثابت ہوئے ہیں ان کے ساتھ کون سا سلوک کیا جائے اور جو قصداً انسانیت اور بھائی چارہ کا خون کر رہے تھے ان کے ساتھ کون سا سلوک برتا جائے۔ آج محبِ وطن ہونے کی بِنا پر اُن کو موتیوں بھرا ہار نہیں پہنایا جا رہا تھا بلکہ مذہب کے نام پر ان کا اس محبّ وطن سے صفایا کیا جا رہا تھا۔ اکثریت، عقلیت کے لئے وحشی جانوروں سے بھی بدتر ہو گئی تھی اور وہ مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس عظیم انسانی المیہ کا منظر ذیل کی عبارت سے آنکھوں میں سما جاتا ہے:۔

> ''پرانی دنیا ختم ہو چکی تھی جو کچھ باقی تھا وہ اس وقت بے کس اتنا حماقت زدہ تھا، ایسا مجبور تھا کہ دنیا اس کا مذاق اُڑا رہی تھی تہذیب کے مرکزوں اور گھواروں میں پلنے والے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے سہراوں کی طرف نکل پڑے امام باڑے ویراں اور مسجدیں شکستہ ہو گئیں پرانے خاندان مٹ گئے زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں ایک عالمِ تہہ و بالا ہو گیا اور تہذیب ہندوں مسلمانوں کا وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد و روایت وہ زمانہ سب کچھ ختم ہو گیا''۔[9]

موصوفہ نے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں اودھ کے جاگیردارانہ تمدن کے زوال اور ان کے عبرتناک انجام کو دلچسپ انداز میں بیاں کیا ہے، نوابوں کے محل اور خادموں کے نگارخانے کچھ اس طرح سے پیش کئے ہیں کہ حق ادا ہوا ہے۔ تقسیمِ ہند کے المیے پر اس ناول میں موصوفہ نے جیسے یکسر فکری اور جذباتی کروٹ لی ہے۔ مشتر کہ تہذیب اور قومی آزادی کے وہ جو خواب دیکھ رہی تھی وہ پی چو کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ 'میرے بھی صنم خانے' کی روشی متحدہ ہند کی حمایتی ہے وہ 'نیوارا' میں مضامین لکھ

کر مشترکہ تہذیب کی روایتی وراثت کو بچائے رکھنے کی سعی بھی کرتی ہے لیکن آخر کار وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتی اس کے لیے اپنے طور سے اگرچہ وہ انگریزوں کے خلاف ایک قومی انجمن بھی بناتی ہے لیکن نظریاتی اور مذہبی خلط ملط کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو پاتی۔ وہ یہ جذبہ رکھتی تھی کہ متحدہ ہند کے لوگوں کو کسی بھی طریقے سے جدا نہ ہونے دیا جائے اور ان کے جذبات و احساسات منتشر نہ ہونے پائے اس میں مشترکہ تہذیب کا درد کوٹ کاٹ کر بھرا ہوتا ہے لیکن تقسیم کے الم ناک واقعات اور اخلاق سوز انجام اس کے خوابوں کے سویروں کو تاریکی میں ڈھانپ لیتے ہیں اور اس کا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ 'نیوارا' میں مضامین کے ذریعے سے ظلم و بربریت کے خلاف دل کی بھڑاس تو نکال لیتی ہے لیکن اس کے وہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو پاتے جو اس نے بحیثیت محبِّ وطن اور مشترکہ تہذیب کے پیروکار کی حیثیت سے دیکھے تھے۔

''سفینۂ غمِ دل'' : قرۃ العین حیدر:۔

'میرے بھی صنم خانے' کے بعد 'ناول سفینۂ غمِ دل'، قرۃ العین حیدر کا تقسیم کے حوالے سے دوسرا ناول ہے۔ موصوفہ نے اس ناول کا آغاز 'بھارت چھوڑو آندولن' ''Quit India Movement'' سے شروع کر کے تقسیمِ ہند اور اس سے رونما ہونے والے فسادات پر ختم کیا ہے۔ ناول کا مجموعی موضوع تقسیمِ ہند، فسادات، تبادلۂ آبادی، ہجرت وغیرہ کے مجموعی اثرات کا جائزہ ہے۔ موصوفہ کا یہ ناول 'آگ کا دریا' کے برخلاف صرف تقسیم کے المیے کو ہی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ موضوعاتی سطح پر اس ناول میں 'میرے بھی صنم خانے' کی تکرار ہے بالکل ان ہی حالات پر بُنا گیا ہے جن حالات کا بیان ناول 'میرے بھی صنم خانے' میں ملتا ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر مجموعی طور پر وہی تاثر اُبھر کر سامنے آتا ہے جو ناول 'میرے بھی صنم خانے' کو اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ دونوں ناولوں کے کردار بھی لگ بھگ ایک ہی طریقے سے پروئے گئے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ 'میرے بھی صنم خانے میں' تمام کردار خیالی ہیں اور 'سفینۂ غم دل' کے تمام کردار حقیقت پر مبنی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ناول کو ایلر ریکسٹن، فواد علی، میر النی، رضا قاسم، عالیہ، ارون راج دانش، ریاض الدین وغیرہ کرداروں کے ذریعے سے آگے بڑھایا ہے۔ سارے کردار سایوں کی طرح قصے میں نظر آتے ہیں۔ ناول 'سفینۂ غمِ دل' میں موصوفہ نے تقسیمِ برصغیر کے حوالے سے اپنی بات کو کچھ اس طرح

سے پیش کیا ہے کہ برصغیر کی موجودہ صورتحال اس کا پیش خیمہ نظر آتا ہے۔تقسیم جہاں مسلمانوں کے لئے ایک طرف مال و جان کے زیاں کے روپ میں سامنے آیا وہیں اس نے برصغیر میں مسلمانوں کی مجموعی حیثیت کو مشکوک بنا کے رکھ دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی شناخت بالکل مسخ ہو کر رہ گئی۔ایک طرف جہاں مہاجروں کو بے شمار صعوبتوں سے گذرنا پڑا تھا تو وہیں دوسری طرف ہندوستان میں لوگ مسلمانوں کا جینا حرام کرنے پر مصر تھے۔ ہندوستان کو ہندوؤں کا ملک قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو یہاں سے بگا رہے تھے اور طعنے کے طور پر مسلمانوں کو کہتے کہ،اگر اسلام کے نام پر تم لوگوں نے اپنا علٰحیدہ ملک بنا لیا ہے تو تمہیں یہاں پر رہنے کا کوئی حق نہیں۔غرض مسلمان دونوں طرف سے پٹ رہے تھے، پاکستان میں وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کا جینا محال ہو رہا تھا اور ہندستان میں ہندوؤں کے غیر انسانی اور سفا کانہ سلوک کی وجہ سے ان کی حیات کا قافیہ تنگ کیا جا رہا تھا۔ایسے میں مسلمانوں کا کوئی یار تھا نہ مددگار۔مذکورہ ناول میں موصوفہ اس المناک واقع کو کچھ اس طرح اپنی فنی صلاحیت سے پیش کرتی ہے:

> ''اس نے آنکھیں اُٹھا کر انسانوں کے ہجوم کی طرف دیکھا جو دھیرے دھیرے گورنمنٹ ہاوس کی طرف بڑھ رہا تھا۔اس نے دیکھا کہ جلوس کے آخری سرے پر نواب رضا قاسم تھے ان کی باریک نفیس مونچھیں نیچے کو جھک آئیں تھیں اور ان کا جام دانی کا انگرکھا اتنا شفاف نہیں رہا تھا یہ لوگ دوسرے نئے دیس سے واپس کر دیئے گئے اور اب یہاں لوٹ کر سر چھپانے کے لئے کسی ٹھکانے کی بھیک مانگ رہے ہیں ایک برہمن نے دوسرے برہمن کو سرگوشی کے لہجے میں کہا اور کنارے کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے لگے "خدا ان اُلو کے بھائیوں پر اب کیا رحم کرئے گا''۔ [10]

مصنفہ نے کہانی کو ایک قصبہ 'گوپالپورہ' سے مشترکہ تہذیب کی پیشکش سے شروع کیا ہے جس میں موصوفہ یہ بات باور کرانا چاہتی ہے کہ تقسیم سے پہلے دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمان آپس میں بھائیوں کی طرح رہ رہے تھے۔دلوں میں مشترکہ تہذیب ایسے گھر کر گئی تھی کہ حوصلہ افزائی کے طور پر لوگ ایک دوسرے کے تہواروں، رسوم و رواج میں شریک ہوتے تھے دونوں تہذیبیں آپس میں ایسے گھل مل گئیں تھیں کہ دونوں مذاہب کے لوگوں میں تہذیبی اعتبار سے فرق کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ بھائی چارے کی ایسی مثال

ڈھونڈ ھنے سے بھی نہیں ملتی۔ ہندو لوگ مسلمانوں کے تہواروں میں میزبانوں کے طور پر شریک ہوتے تھے اور مسلمان ہندوں کے تہواروں میں، یہاں تک کہ راسخ العقیدہ مسلمان، کٹر ہندو بھی مشترکہ تہذیب کا خیال رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔لوگ آپس میں خوشیاں اور غم بانٹتے تھے اور اس چیز کو اپنے لئے باعثِ فخر مانتے تھے۔صدیوں سے سینوں میں محفوظ اس وراثت کو کوئی کھونا چاہتا تھا نہ ہی کسی وجود نے اس وراثت کو کھونے کا تصور تک کیا تھا لیکن وہی ہوا جس کا سب کو ڈر تھا۔ برصغیر کے لوگ انگریزوں کے بچھائے ہوئے جال میں ایسے الجھ گئے جس سے باہر نکلنا قطعی طور پر ناممکن سا نظر آ رہا تھا۔جس آزادی کے لئے دونوں قوموں نے جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے وہیں آزادی دونوں قوموں کے لئے سم قاتل بن کے رہ گئی۔یہ وہ آزادی نہیں تھی جس کے لوگوں نے خواب دیکھے تھے اور جس کے لئے لوگوں نے انگریزوں کے مدِ مقابل کھڑے ہوکر جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔غرض تقسیم کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے جس سے مشترکہ تہذیب آپسی بھائی چارہ اور ملکی سالمیت کا شیرازہ بکھر گیا اس دوران میں انسان جیسے اشرف المخلوقات کے درجے سے گر کر وحشی بن چکے تھے کسی کی آنکھوں میں ماں بہن کی تمیز نہ رہی اور تاریخ کے وہ سیاہ باب قائم کئے جن کی مثال لوگ آج بھی دیتے ہیں۔پنجاب میں ہزاروں کی تعداد میں انسانی جانوں کا زیاں ہوا، ہزاروں کی تعداد میں گھر نذرِ آتش کئے گئے اور لاکھوں کی تعداد میں عورتوں کی عزتوں کے ساتھ کھیلا گیا ان سارے واقعات کو موصوفہ نے بڑی ہی فنکارانہ مہارت سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ایک جگہ بلوائیوں اور فسادیوں کے ظلم کی منظرکشی کرتے ہوئے وہ لکھتی ہے:

> ''میں نے اس اندھیری میں ہاتھ بڑھا کر اُٹھنا چاہا لیکن چاروں اور سے بہت ساری چیزوں نے مجھے دبا دیا تھا اور میری سانس رکی ہوئی تھی۔ہم کیا ہے، یہ کیا ہو رہا ہے مہا کلپ کا یہ کون سا دور ہے؟ دھوئیں کے بادلوں کو اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے میں نے دیکھنے کی کوشش کی یہ سامنے جو جلے ہوئے راکھ کے ڈھیر پڑے ہیں یہ 'آشیانہ' ہے جسے میرے مرحوم باپ نے مدتیں گذاریں بڑے چاو سے تعمیر کرایا تھا اور آج جون ہے اور آج اس سمے بالآخر ہم نے اپنی قسمت کا فیصلہ دیکھ لیا ہے''۔ [11]

موصوفہ نے اس ناول کے ذریعے سے یہ بات بھی سامنے لانے کی احسن سعی کی ہے کہ تقسیم کے دوران بہت سارے ایسے خاندانوں کو بھی ہجرت کرنا پڑی جنھوں نے ہندوستان ہی میں رہنے کا تہیہ کیا تھا۔انہوں نے بہت دنوں تک تقسیم سے رونما ہونے والے فسادات کو برداشت کیا اور ان کو وقتی سمجھ کر حالات سازگار ہونے کا انتظار کر رہے تھے لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا بلکہ سب کچھ ان کی امنگوں اور آرزوں کے برخلاف ہوا اس حوالے سے ان کو ہجرت کرنا پڑھ رہی تھی اور دوسری طرف میراث ومملکت اور آباو اجداد کے مدفنوں سے بھی ترکِ تعلق اختیار کرنا پڑھ رہا تھا جب کہ انکے دلوں میں چھوڑی ہوئی ان ساری چیزوں کی عظمت موجود تھی لیکن تقسیمِ ملک سے رونما ہونے والے حالات وواقعات نے ان کو غیر مطمئین کر کے رکھ دیا تھا۔سارے لوگ النفسی النفسی کے عالم میں اپنی جانوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ایسے میں ایک لڑکی کے منہ سے بے تحاشہ آواز نکلتی ہے جس کی منظر کشی موصوفہ نے کچھ اس طریقے سے کی ہے:

> ''ابا جان آپ نے بالکل غلط کہا تھا کہ بنارس کی صبحوں اور موسم کی ان کیفیتوں کو کوئی ہم سے نہیں چھین سکتا۔ یہ ہماری اپنی ہیں اور ہمارے وجود کی کیفیت کا ایک لازمی جزو ہے اب میاں آپ کے تو انقلاب کے سارے خواب بھی کچھ غلط ہی ثابت ہوئے اب جب کہ ہم 'عیش باغ' میں آپ کی موتیا کی جھاڑیوں کے پاس آپ کو خدا حافظ کہنے آئے ہیں۔شاید آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم پر کیا بیتی اور کیوں ہمیں آپ کو چھوڑنا پڑا۔ ہمارے اور اس مٹی کے درمیان جس میں سے آپ پیدا ہوئے اور جس میں آپ کو چھپا دیا گیا ہے، اب ہزاروں میل کا فاصلہ اور صدیوں کی تنہائی کا بُعد ہوگا اب ہم ایک دوسرے کے لئے غیر ملکی ہیں۔کیوں کہ ہم ترک وطن کر رہے ہیں''۔ ۷

مصنفہ نے ناول میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تقسیمِ ملک کے دوران جہاں عام آدمی مصیبتوں میں گرا ہوا تھا وہیں دوسری طرف ہندستانی فوج بھی کوئی مثبت کام انجام نہیں دے رہی تھی۔وہ حالات کو قابو میں لانے کے بجائے جلتے پر تیل کا کام کر رہے تھے۔وہ بھی عام ہندوؤں کی طرح مسلمان مہاجروں کو قیامِ پاکستان کے طعنے دے رہے تھے اور ان کو دھتکار رہے تھے۔غرض تقسیمِ ملک کی وجہ سے پورے برصغیر کا نقشہ ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔اسی کے ساتھ ہندو مسلم بھائی چارے کا جنازہ نکل گیا،

جاگیرداری کا خاتمہ ہوگیا، لوگ بے گھر ہوگئے اور ذریعۂ آمدنی کا خاتمہ بھی ہوگیا۔ صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی رواداری کا خاتمہ بھی ہوگیا۔

آخر پر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ 'سفینۂ غمِ دل'' مصنفہ کا وہ ناول ہے جس میں انہوں نے فکشن کے پیرائے میں قارئین کے سامنے سچی تصویر سامنے لانے کی احسن سعی کی ہے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی قرار پائی ہے۔ فلسفیانہ اندازِ بیان سے لبریز یہ ناول کھوکھلی جزباتیت کا شکار نہیں ہوا ہے بلکہ قاری کے ذہن میں حقائق اسطرح ڈالتی ہے کہ حق ادا ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد نسیم اپنی کتاب "اردو ناول پر تقسیمِ ہند کے المیے کے اثرات" میں لکھتے ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر کا ناول 'سفینۂ غمِ دل' تقسیم ہند کے المیے کے موضوع پر ایک کامیاب ناول ہے اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جذباتیت سے مبرا فلسفیانہ اندازِ بیان سے اس کے واقعات کی پیشکش ہوئی ہے اور تقسیمِ ملک کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات کی اندوھناک تصویر کشی کی گئی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی تقسیمِ ملک کی المناکیوں کا تجزیہ اس ناول میں بہت ہی فنکارانہ انداز میں کیا گیا ہے''۔ [۱۳]

''آگ کا دریا'' کی اہمیت، تقسیم کے حوالے سے:

ہر کسی فنکار کی کوئی نہ کوئی خوبی یا کوئی نہ کوئی تخلیق ایسی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ فتح کے جھنڈے گاڑتا ہے اور بہرحال وہی اس کی پہچان بن جاتی ہے۔ ادب میں مختلف فن کار مختلف طریقوں سے مشہور و معروف ہوئے ہیں۔ کوئی اپنی منفرد فنی صلاحیتوں سے اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب ہوا، کوئی وسیع مطالعہ سے اور کوئی اپنے اندازِ بیان سے۔ اس تناظر میں جب ہم قرۃ العین حیدر کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کی مشہوریت کے مختلف اسباب میں فکشن ایک اہم سبب بنا۔ اردو ادب جب تک زندہ ہے اس کا نام بھی تب تک زندہ و تابندہ ہے۔ لیکن جس تخلیق نے ان کو عالمی ادب سے لے کر مقامی ادب تک ایک اعلیٰ مقام عطا کیا وہ ناول ''آگ کا دریا''۔ یہ ناول ان کے منجملہ فن اور شخصیت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اس ناول کے ذریعے سے عینی کے نام نے اردو ادب میں ایک ایسے ستارے کی سی حیثیت اختیار کی ہے جو ہمیشہ چمکتا دھمکتا رہتا ہے اور کبھی ماند نہیں پڑھتا۔

تقسیمِ ہند کے المیے کے موضوع پر قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ تقسیم کے حوالے سے اس کا یہ تیسرا ناول ہے جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ ناول ''آگ کا دریا'' کی کہانی کا آغاز اب سے ڈھائی ہزار سال پہلے کی ہندوستانی تہذیب سے شروع ہوتا ہے جو شراستی اور پاٹلی پتر میں سبز و شاداب ہوئی اور تقسیمِ ہند کے واقعات کے تاریخی اور تہذیبی پسِ منظر میں ہندوستانی تہذیب کو پیش کرتا ہوا ختم ہو جاتا ہے۔ یہ موصوفہ کا وہ ناول ہے جسے اردو کی تاریخ میں موضوع، ہئیت اور زخامت کے اعتبار سے اہم مقام حاصل ہے۔ یہ ناول ۶۴۲ صفحات اور ۱۰۱ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں موصوفہ نے وقت کو آگ کے دریا سے مقابلہ کر کے استعاراتاً پیش کیا ہے۔ واقعات کی پیشکش کے اعتبار سے اس کے پلاٹ کو چار عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً، قدیم ہندوستانی تاریخ سے مسلم دورِ حکومت کے اوائل دور تک، حصہ دوم اوائل دور سے مسلم دورِ عروج تک، حصہ سوم اودھ کے بادشاہوں کے دورِ زوال پر مرکوز ہے اور آخری حصہ تقسیم کے پسِ منظر اور پیشِ منظر پر محیط ہے۔ اس ناول کی وجہِ تصنیف بتاتے ہوئے فن کارہ لکھتی ہے:

> ''ملک کیوں تقسیم ہو گیا۔ تقسیم تاریخی حیثیت سے ناگزیر تھی اس سوال نے مجھے فلسفہ تاریخ کی سمت کھینچا۔ اس کا جواب دینے کی کوشش میں ایک ناول "آگ کا دریا" لکھا۔ دریا کو زمانے کا symbol بنا کر میں نے تین ہزار سال کی پھیلی ہوئی اور اُلجھی ہوئی ہندوستانی تاریخ میں سے ہندوستانی شخصیت کی عظمت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی۔'' [۱۴]

ڈھائی ہزار سال کے عرصے کو اپنے اندر سمیٹے ہوا یہ ناول ایک طویل مدتی ناول ہے۔ اس ناول میں موصوفہ نے ویدک کال، ترک، مغل، انگریز اور تقسیمِ ہند جیسے واقعات کو بڑے ہی فنکارانہ پیرائے میں پرویا ہے۔ ان واقعات میں چار ایسے نام ہیں جو بار بار ناموں کے ہلکے تفاوت کے ساتھ برابر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان میں گوتم، ہری شنکر، چمپا اور کمال جیسے نام قابلِ ذکر ہیں۔ گوتم ہندوستان کے باشعور اذہان کی نمائندگی کرتا ہے۔ نام کی مماثلت کی وجہ سے اس میں گوتم بدھ کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے باقی ناولوں کی طرح پلاٹ، مکالمہ، کردار اور آغاز و انجام کی طرف زیادہ زور نہیں دیا

ہے بلکہ سارا زور حالات کو پیش کرنے پر ہے۔ حالات و واقعات ہوتے رہتے ہیں اور کردار بھی نئے لبادے اور نئے رویئے اختیار کرکے ہر کسی دور میں مختلف مذاہب کے پیروکار کی صورت میں مدوجذر سے گذرتے رہتے ہیں۔حالات وواقعات گوتم کو کمال اور کمال کو عامر رضا بنادیتے ہیں۔ چمپا کو چمپا بائی، چمپا بائی کو چمپا باجی اور چمپا باجی کو چمپا احمد میں تبدیل کرتے ہیں۔ گویا حالات کے بہاو کے سامنے کرداروں کی اہمیت صفر تک پہنچ جاتی ہے۔ ویدک عہد میں حالات ایسے ہوتے ہیں کہ چمپا پچاس سالہ فوجی کی بیوی بن جاتی ہے۔ یہی حالات چمپا کو ابالمنصور کمال کی بیوی بننے نہیں دیتے ہیں۔ یہی حالات چمپا کو لکھنو کی چمپا بنا دیتے ہیں، حالات ہی چمپا کو تقسیمِ ہند سے پہلے زمیندار گھرانے کی باجی بنادیتے ہیں اور انہی حالات کے تبادل سے تقسیم کے بعد چمپا باجی کو چمپا احمد کے روپ میں مرادآباد کے کٹ گھر میں ایک تاریک مستقبل کے حوالے کردیا جاتا ہے۔

ہمارا موضوع چونکہ تقسیم برصغیر کے حوالے سے ہے اس لئے موضوع کی مناسبت سے ہی ناول ’آگ کا دریا‘ کا ذکر کریں گے۔ تقسیمِ برصغیر کے مناظر ناول کے آخری حصے میں ملتے ہیں۔اس حصے میں نیلمبر دت، چمپا احمد، عامر رضا، گوتم، کمال، ہری شنکر، طلعت اور نرملا وغیرہ تمام کردار ایک مسلسل داخلی وذہنی زندگی گذارتے نظر آتے ہیں۔ جب ملک انگریزوں کے شکنجے سے آزاد ہو جاتا ہے تو برِصغیر کی علاقائی سیاست بھی ہتھکنڈے کھیلتی ہے۔فرقہ واریت کو ہوا دی جاتی ہے،مسلمان اپنے مذہب کے نام پر الگ ملک بناتے ہیں اور اکثر مسلمان وہیں پر قیام پذیر ہوجاتے ہیں اور اس نئے ملک کو پاکستان کا نام دیا جاتا ہے۔ ہندو اور سکھ ہندوستان میں قیام کرکے اس کو اپنا ملک متصور کرتے ہیں۔ ہزاروں سالوں سے متحدہ ہندوستان میں ایک مشترکہ تہذیب وجود میں آئی تھی۔ایک ایسی تہذیب جہاں مسلمان ایک دوسرے کے ہمدرد اور نیک خواہ تھے، جہاں ہندو، مسلمان، جاٹ، سکھ، کمہار، مغل سب ایک ہی دھرتی کے سپوت تھے، جہاں سب ہمسائے اور ایک ہی زمین کے جائے تھے۔ جب نہ کوئی مسلمان ہندو کا گھر جلاتا تھا نہ ہی کوئی ہندو مسلمان کو ہاتھ ملانے سے کتراتا تھا۔ جب جاٹ، سکھ، ہندو مسلمان ایک ہی پیالی میں پانی پیتے ،کشتی کرتے اور ہل چلاتے تھے۔ایک کا کام ہوتا تو ساری بستی کے لوگ اکٹھے ہوکر پہلے ایک کا کام نپٹایا کرتے تھے پھر اسی طریقے سے ساری بستی کا کام باہمی اتفاق اور افہام وتفہیم کے ساتھ انجام پاتا تھا۔ایک

ہی جگہ سب کھانا کھاتے ،ناچتے گاتے ڈھول بجاتے غرض اسی طریقے سے ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے۔اس بات سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا کہ بچہ مسلمان کا ہے،سکھ کا ہے یا ہندو کا۔اس بچے کو جاتے ہوئے کوئی بھی کندھے پر اٹھا کے پیار کرتے ہوئے نہ تھکتا تھا۔اس مشترکہ تہذیب میں ہندو اپنا گھر چھوڑ کر بھی مسلمان کا ساتھ نہ چھوڑتے کیونکہ دونوں قوموں کا تصور بغض وعناد پر نہ تھا بلکہ صرف عبادت کے اک الگ تصور کا تھا۔محبت اَنگ اَنگ میں رچی بسی ہوتی تھی اور ہر سانس ایک دوسرے پر قربان کرنے کو ہی دونوں قوموں کے لوگ اپنی وفاداری اور وفا شعاری سمجھتے تھے۔پیار ومحبت ہی سب کی زبان تھی اور ایک دوسرے کا احساس ہی سب کے دلوں کو جوڑے رکھتا تھا۔اس تہذیب میں سب ایک تھے،محبت اور انسانیت کے رشتے میں سب ایک تھے،نہ تفریق تھی نہ تفرقہ ،نہ ملکی عناد نہ سرحدی دشمنی۔بس ایک رشتہ پیار ومحبت کا رشتہ اور اس رشتے سے بڑھ کر کوئی رشتہ ہو نہیں سکتا لیکن تقسیم نے ان تمام بندھنوں اور رشتوں کے درمیان ایک ایسا پردہ حائل کیا جس نے جیتے جی تمام لوگوں سے زندگیوں کے مطالب چھین لئے۔دو نئے ملکوں کی تعمیر کی آڑ میں مشترکہ تہذیب اور روایتی وراثت کو مٹایا جا رہا تھا۔دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے خلاف زہر آلودہ فضا قائم کرنے کے لئے لٹریچر اور باقی مواد تخلیق کیا جا رہا تھا جس کی وجہ سے تنگ نظری ،قدامت پرستی،شدت پسندی کا رجحان عام ہوا۔موصوفہ ناول میں اس بات کی رہنمائی کرتے ہوئے لکھتی ہے:

> ''فارسٹر نے اپنا ناول ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا۔اس وقت اس نے ڈاکٹر عزیز کو ہندوستان کے نمائندہ کردار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔۔آج اگر فارسٹر دوسرا'' A passage to India'' لکھے تو اسے اپنا یہ کردار بدلنا پڑے گا۔اب ڈاکٹر عزیز ہندوستان کا نمائندہ نہیں رہا۔اب ہر مسلمان لامحلّہ پاکستانی ہے اب ہندو ہندوستان کا صحیح نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔''[۱۵]

تقسیمِ ملک کے بعد چونکہ سب کچھ بدل جاتا ہے دونوں قوموں کے درمیان پیار،محبت اور انسیت، نفرت،بغض وعناد اور دشمنی میں بدل جاتا ہے۔صدیوں سے چلا آ رہا وہ بھائی چارہ ،غیض وغضب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔کل تک جو لوگ ایک ہی برتن میں کھاتے تھے وہی لوگ آج ایک دوسرے کا گلا کاٹ

رہے تھے،کل تک جو مرد عورتوں کے محافظ قرار دیئے جاتے تھے آج انھوں نے درندوں کی شکل اختیار کی ہوئی تھی۔انہیں کی عصمتوں پر ڈاکے ڈالنا شروع کر دیئے،کل تک جن معصوم بچوں کو کسی تفریق کے بجائے شانوں پر بٹھایا جاتا تھا آج وہیں لوگ انہیں بچوں کو نیزوں پر چڑھانے کو بہادری سمجھ رہے تھے۔عوام کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جارہا تھا اور حاکم اس خونین کھیل کا مزہ لے رہے تھے دونوں طرف سے اس خونین کھیل میں لاکھوں کی تعداد میں انسانی جانوں کا زیاں ہوا، لاکھوں کی تعداد میں عورتوں کی عصمتیں تار تار کی گئیں لیکن حکمران طبقہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔آزادی کے بعد ہند میں قائم ہندو کلچر اور فنون کا احیا کیا جارہا تھا اور فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے سے باہر دھکیل رہے تھے تقسیم کے بعد ہری شنکر اور گوتم جیسے آدمی حکومت کے اعلی آفیسر بن جاتے ہیں جو مسلکی اور نسلی بندھن میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔عامر رضا جیسے آدمی اسلامی جمہوریا پاکستان کے حاکم قرار پاتے ہیں جس کو اسلام کی سدھ بدھ تک نہیں ہوتی۔گوتم اور ہری شنکر ہندوستان کے ان ہندو جوانوں کے ترجمان ہیں جو دل میں مشترکہ تہذیب کا درد چھپائے بیٹھے تھے لیکن اس حوالے سے کوئی بھی اقدام کرنے سے قاصر ہی نظر آتے ہیں۔وہ چاہتے ہوئے بھی اور بڑے عہدوں پر فائض ہونے کے باوجود بھی حالات اور نظریئے کے تفاوت کی وجہ سے کمال کو پاکستان ہجرت کرنے سے نہیں روک پاتے۔عامر رضا،اس ناول میں دراصل ان نوجوانوں کا نمائندہ ہے جو زندگی میں رنگ رلیوں اور شوخ حرکتوں کے شوقین ہوتے ہیں اور اپنی آسائش کے لئے کوئی بھی نیچ کام کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔پاکستان بننے پر جہاں بہت سارے خاندان اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اور نئے ملک کے لئے لُٹا کے اپنے چہیتے ملک ہجرت کر کے گئے۔تاہم بہت سارے لوگ اپنے نفس اور مادی آسایشوں کے لئے بھی وہاں چلے گئے۔ان کا اس پاک سرزمین سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی قلبی لگاو تھا البتہ اپنے مفاد کے لئے وہ اس نئے ملک میں آگے آگے دوڑ رہے تھے۔کمال جیسے نیشنلسٹ مسلمان ہندوستان میں رہنے کو ہی ترجیح دیتے ہیں جن کے ساتھ تقسیم کے بعد ان کی توقعات کے برخلاف ظالمانہ اور انسانیت سوز انجام ہوتا ہے۔کانگریس کا حامی ہونے کے باوجود بھی اس کو مسلمان ہونے کی سزا مل جاتی ہے اور آخر کار اس کو اپنے چچا سمیت مقامی لوگوں کی بدسلوکیوں کی وجہ سے مجبوراً پاکستان جانا پڑتا ہے۔

کمال جب وطن کی خدمت کے جذبے سے برطانیہ سے اعلٰی نوکری چھوڑ کر ہندوستان وارد ہوتا ہے تو اسے وطن کی ہر کوئی چیز تبدیل نظر آتی ہے۔آزادی کے بعد چونکہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوتا ہے اس لئے کمال کا اپنا خاندان بدحالی اور ابتری میں چلا گیا ہوتا ہے۔جس حویلی میں یہ رہ رہے ہوتے ہیں وہ اس کے بڑے ابا نواب تقی رضا بہادر کے نام درج ہوتی ہے۔نواب تقی کا بیٹا عامر رضا چونکہ پہلے ہی پاکستان روانہ ہوا ہوتا ہے اس لئے یہ حویلی کسٹوڈین کے قبضہ میں چلی گئی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کو لکھنو کے ریفوجی کیمپ میں پناہ لینا پڑتی ہے۔ یہاں سے ہجرت کرنے کی ایک وجہ تعصب بن جاتی ہے۔کمال کو مذہبی تعصب کی وجہ سے وہ عہدہ نہیں مل پاتا ہے جس کا وہ مستحق ہوتا ہے بلکہ اس کی جگہ وہی عہدہ ایک معمولی بی۔اے۔پاس ہندو لڑکے کو دیا جاتا ہے۔تقسیم کے بعد اس منظر نامے کو دیکھ کر کمال پر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی وسیع وعریض زمین تنگ ہو چکی ہے۔ یہاں پر اب مشترکہ تہذیب کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بج گیا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اس بے رخی اور مایوسی کو مصنفہ نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

> ”تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمہارا کلچر اور
> تمہارے نظرئے علٰحیدہ ہے تو جاو پاکستان“۔[۱۶]

کمال جس کے لئے ہندوستان میں رہنے کے لئے زمین تنگ کی جاتی ہے کو پاکستان ہجرت کرنا پڑھتی ہے لیکن وہاں پہنچ کر بھی اس کو اُن ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جن کی وجہ سے اس نے یہاں سے ہجرت کی ہوئی ہوتی ہے۔اس طریقے سے موصوفہ نے اس کردار کے ذریعے سے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ پاکستان کا جو تصور تھا وہ اگرچہ مسلمانوں کی بھلائی کے لئے اچھا تھا لیکن وہاں پر اس تصور کا عملی ثبوت کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملا۔وہاں پر ہجرت کے ساتھ ہی ملت قبیلوں میں بٹ چکی تھی۔خطے اندر ہی اندر تقسیم در تقسیم ہو چکے تھے،سفارشوں کے بغیر ملازمت نہیں ملتی تھیں،طلبا کی پڑھائی کے مسائل اور نوکریوں میں ترقی وغیرہ نہ جانے کتنے مسئلے سر اٹھائے کھڑے ہوئے ہوتے ہیں۔کمال کو کراچی میں کسی بھی طریقے سے سائنسداں کا عہدا مل جاتا ہے۔نوکری سنبھالنے کے ایک بار جب وہ ہندوستان کے سفر پر آتا ہے تو سفر کرتے ہوئے اس کو سب کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ ہندوستان میں قیام کے دوران جس جگہ وہ رہ رہے تھے وہ جگہ بھی اس کو کچھ انجان سی نظر آرہی تھی اور وہ خود کو اس سفر کے دوران اجنبی سا محسوس پاتا ہے

۔ریل میں سفر کے دوران اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال کھڑے ہوتے ہیں اور ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔قرۃ العین حیدر کمال کے اس ذہنی تناو کی نمائندگی کچھ یوں بیان کرتی ہے:

"اسے لگا لوگ اسے سب مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں ٹرین کی پٹریوں سے یہی آواز آ رہی تھی غدار، جاسوس، غدار، جاسوس اس نے ہڑ بڑا کے آنکھیں کھولیں''۔ ۱۷

کمال کا تقسیم کے بعد یہاں رہنا اور متحدہ ہند کے لئے کوشاں رہنا دراصل ان کانگریسیوں کی نمائندگی کرتا ہے جو تقسیم کے مصائب کو جھیلنے کے بعد بھی ہندوستان ہی میں رہنا چاہتے تھے لیکن ان کے لئے یہاں پر رہنے کے لئے زمین تنگ کر دی گئی۔ بے شمار قربانیوں کے بعد بھی کمال کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ہجرت کرنے سے اسے شنکر اور گوتم جیسے قریبی اور جانسار دوست بھی روک نہیں پاتے ہیں۔مختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ '' آگ کا دریا''، قرۃ العین حیدر کا یہ ایک قابلِ قدر اور اردو ادب کے چند بڑے ناولوں میں سے ہے جس میں انہوں نے تین ادوار میں ہندوستانی تہذیب وثقافت اور قومی یکجہتی کے چربہ کو پیش کیا ہے اور چوتھے اور آخری باب میں تقسیم کے بعد اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنفہ نے یوں تو تقسیم کے المیے پر بہت کچھ لکھا ہے اور بہت اچھا بھی لکھا ہے لیکن اس ناول میں موصوفہ نے کہیں نہ کہیں جانبداری سے کام لیا ہے۔ اگر چہ وجوہات کچھ بھی رہے ہوں لیکن ایک فن کار کو ہمیشہ غیر جانبداری کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔موصوفہ ایک طرف جہاں تقسیم کے المیے کو درد مندی سے بیان کرتی ہے مگر وہیں تقسیم کا المیہ بیان کرتے کرتے وہ تقسیم کا سارا ذمہ دار مسلم لیگ کو گردانتی ہے۔ وہ مسلم لیگ پر الزام دھرتے ہوئے کہتی ہے کہ اگر مسلم لیگی تقسیم ملک کی تحریک نہ چلاتے تو شاید یہ تمام مصیبتیں سامنے نا آتیں، مشترکہ تہذیب کا خاتمہ نہ ہوتا وغیرہ وغیرہ۔غرض یہ کہ اس ناول میں موصوفہ تقسیمِ ہند کے المیے کو مسلم لیگ کی دین قرار دیتی ہے۔ان کے اس فعل کو اگر چہ کچھ لوگ ان کے نڈرپن اور بے باکی سے تعبیر کرتے ہیں تاہم بحیثیتِ فنکارہ اس بات کو نڈرپن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کا تقسیم کے حوالے سے متعصب رویہ ہی مانا جائے گا۔ کیونکہ جس چیز کی حقیقت تاریخی اور استدلالی اعتبار سے

متعین نہیں ہے اس حوالے سے فن کار کی اپنی طرف سے کوئی رائے قائم کر لینا فن اور موضوع دونوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ پروفیسر عبدالسلام کو بھی قرۃ العین حیدر کے اس بیان میں تعصب اور غیر جانبداری کی بو آتی ہے۔اُس کو اعتراض ہے کہ مصنفہ پاکستان کے بیان میں مصلحت سے بیگانہ ہے مگر ہندوستان کے بیان میں وہ نہ ہی نڈر پن سے کام لیتی ہے نہ ہی بے جگری سے۔ناول کی ذیل کی عبارتیں مصنفہ کی غیر جانبداری پر سوال کھڑا کرتی ہیں:۔

''کراچی۔مملکتِ خداداد پاکستان۔دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اور دنیا کی پانچویں بڑے ملک کا دارالحکومت جہاں کے سلمز اور پناہ گزینوں کے جھونپڑے عجائباتِ عالم میں شمار کئے جاتے ہیں خصوصاً وہ غلیظ ترین بھیانک،بھگیاں،جو قائدِ اعظم کے مزار کے پاس پھیلی ہے''۔[۱۸]

فن کار کے ذریعے سے بے ڈھنگے طریقے سے کسی ملک کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنانا کسی بھی طریقے سے صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ایک فن کار کو فن کی سطح پر ان چیزوں سے مبرا اور پاک ہونا چاہیے۔فن کار جتنا اپنے کام سے کام رکھے گا اور اپنے فن کے بننے سنورنے پر جتنا توجہ مرکوز کرئے گا اتنا ہی اس کے لیے اور اس کے فن کے لیے بہتر ہے اور اس کی کامیابی کا راز بھی اسی چیز میں پنہاں ہوتا ہے۔کسی چیز کی طرف داری میں اتنا آگے نکلنا کہ اس چیز کی حدیں ہی ڈھا جائیں یقیناً گھاٹے کا سودا ہے۔جس چیز کا تاثر عینی کے اس ناول سے براہِ راست ایک کاری پر پڑھتا ہے۔وہ اپنے فن کی حدیں پھلانگ کر جانبداری کے پنجرے میں بند ہوگئی ہے۔ایک اور جگہ پاکستان پر طنزیہ لہجہ میں نشانہ سادھتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

''ایک اور عجیب وغریب چیز یہ ہے کہ ملک کے حالات سے لوگ حد سے زیادہ نالاں ہیں۔اقتصادی مشکلات گرانی،رشوت ستانی،اقربا پروری،بے ایمانی،چارسوبیسی،سیاسی گنڈہ گردی۔وغیرہ وغیرہ کا روزانہ بلا ناغہ اخباروں کے ایڈیٹوریں میں ذکر ہوتا ہے''۔[۱۹]

مصنفہ جب بھارت کی بات کرتی ہے تو باتیں نڈر پن اور بے باکی سے بالکل خالی ہوتی ہے۔نہ ہی وہ کھل کر بات کرتی ہے اور نہ ہی بھارت کے تئیں کسی منفی رجحان کا اظہار ہی ملتا ہے بلکہ کہنا تو یہ چاہیے کہ اس کو

ہندوستان ہی مشترکہ تہذیب کا پاسبان اور محافظ نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے طنز کے تیر یک طرفہ صرف پاکستان پر ہی وار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مصنفہ ناول میں تقسیم تک آتے آتے بڑے چاو سے مشترکہ تہذیب کے گیت گنگناتی پھرتی ہے اور پاکستان کے قیام سے اس مشترکہ تہذیب کا خاتمہ ہوگیا۔ ہوسکتا ہے یہ واقع مصنفہ پر بہت ساق گذرا ہو اس لیے جذبات پر قابو نہیں کر پائی ہے۔

''اب تو لوگ کہتے ہیں کہ یار ہمیں بیرونی ممالک میں خود کو پاکستانی کہتے شرم آتی ہے یہی احساسِ کمتری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے''۔[۲۰]

موصوفہ کے ان بیانات سے قطع نظر جب ہم ناول پر مجموعی نگاہ ڈالتے ہیں تو یہی پاتے ہے کہ وقت ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وقت ہی انسانی اصول وضوابط اور انسانی معاشرے کی تعمیر کرتا ہے اور وقت ہی ان تعمیر شدہ چیزوں کو منہدم بھی کرتا ہے۔ ناول کے تین دور مشترکہ تہذیب، ہندو مسلم اخوت اور بھائی چارے پر مشتمل ہے۔ چوتھے دور کے ذریعے سے موصوفہ نے تقسیم کے المیے کو کچھ اس طریقے سے پیش کیا ہے کہ تین ادوار پر مشتمل وہ سارے احساسات و جذبات اچانک وقت کی تیز دھارا کے سامنے نیا رُخ اختیار کر جاتے ہیں اور وقت کا ریلہ ایک ایسا طوفان بپا کر دیتا ہے کہ صدیوں کی وراثت پل بھر میں خاک میں مل جاتی ہے اور صدیوں سے ایک ساتھ رہ رہے لوگوں کو بھی جدا جدا کر دیتا ہے۔

آخرِ شب کے ہمسفر: قرۃ العین حیدر:۔

تقسیمِ برصغیر کے حوالے سے یہ ناول قرۃ العین حیدر کا چوتھا ناول ہے جو ۱۹۷۹ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ مصنفہ نے باقی ناولوں کے برخلاف اس ناول میں ڈھاکہ کو قصے کا مرکز ومحور بنایا ہے جبکہ باقی ناولوں کا محلِ وقوع اودھ رہا ہے اور وہیں کی چار حویلیوں کے ٹوٹنے وبکھرنے کے حوالے سے تقسیم در تقسیم کے المیے کو فکشن کا جامعہ پہنایا ہے۔ موصوفہ کا یہ ناول تقسیم کے حوالے سے بقیہ تین ناولوں، 'میرے بھی صنم خانے'، 'آگ کا دریا'، اور 'سفینہ غمِ دل' سے پیش شدہ ماحول اور فضا کے اعتبار سے مختلف النّوع ہے۔ پہلے تین ناولوں میں موصوفہ نے اُتر پردیش کے جاگیردارانہ نظام کو مرکز ومحور بنایا ہے اور اسی ماحول سے کہانی کی تار و پود کو بُنا ہے لیکن متذکرہ ناول ان سے ہٹ کر اور جداگانہ ہے۔ یہ ناول ان کے شعور کی بالیدگی اور

وسیع مطالعہ کی غمازی کرتا ہے۔عبدالمغنی اس حوالے سے اپنے قلم کو جنبش دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آخرِ شب کے ہمسفر'' کی انقلاب پسندی کے لئے اُبھرتے ہوئے نئے بنگال کا موقع ومحل ہی موزوں تھا اس سے ناول نگاری کی تنقیدی حس کے ساتھ ساتھ اس کے تاریخی احساس کی گہرائی کا سراغ ملتا ہے۔شعور کی بالیدگی اور معلومات کی وسعت کا پتہ بھی دونوں ناولوں میں ملتا ہے۔اس سے وسعتِ تخیل اور ایک وسیع انسانی ہمدردی کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔اودھ کا خون تو قرۃ العین حیدر کی رگوں میں دوڑ رہا تھا،لیکن بنگال کی روح میں اُتر کر انھوں نے اپنی زبردست ذہنیت اور قوتِ تصور کا کارنامہ دکھایا ہے''۔[۲۱]

زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو موصوفہ کے دو ناول اس سے پہلے ہی اس دور کے حوالے سے چھپ کر سامنے آئے تھے۔لیکن موصوفہ نے اس ناول میں مکاں کی تبدیلی سے اپنی اعلیٰ ظرفی اور اعلیٰ انسانی ہمدردی کا ثبوت دیا ہے۔موصوفہ کا یہ ناول ۴۶ ابواب پر مشتمل اور ۳۴۸ صفحات پر محیط ہے اس کا آغاز بھی 'سفینۂ غمِ دل'، کی طرح ۱۹۴۲ء سے ہی ہوتا ہے۔لیکن مکاں کے تعین کی وجہ سے دونوں ناولوں کا پلاٹ جدا جدا ہے اور دونوں کا انجام مختلف ہوتا ہے۔'سفینۂ غمِ دل' کا آغاز تقسیم ملک اور اختتام قیامِ پاکستان پر ہوتا ہے جب کہ' آخرِ شب کے ہمسفر' کا آغاز حصولِ آزادی اور تقسیمِ ہند سے ہوتا ہوا قیام بنگلہ دیش پر خاتمہ پذیر ہوتا ہے۔موصوفہ نے اس ناول کا ترجمہ انگریزی میں خود (fire flies in the mist) کے عنوان سے کیا ہے جو انگریزی ادب کے حلقوں میں کافی سراہا گیا۔

موصوفہ نے یوں تو اس ناول کو بہت سارے کرداروں کے ذریعے سے آگے بڑھایا ہے جن میں دیپالی سرکار، ریحان الدین احمد، رروزی بنرجی، جہاں آرا، اومارائے، یاسمین بلمونٹ، نواب قمرالزماں چودھری، بنوے چندرسرکار، ناصرہ نجم السحر وغیرہ اہم ہیں ۔موصوفہ نے جن کرداروں کے ذریعے سے تقسیم کا المیہ بیان کیا ہے ان میں دیپالی سرکار، یٰسمین بلمونٹ اور ریحان الدین وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔یہ سب کردار حب الوطنی سے سرشار، ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے ہر ممکن قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں اور متحدہ ہند کے قیام کے لئے ہمیشہ سینہ تان کے کھڑے ہوتے

ہیں۔انگریزوں کی ہٹ دھرم اور غیر مہذب پالیسیوں کے پیشِ نظر بیشتر کردار اعتدال پسندی کو ترک کر کے دہشت پسندی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا مجبور کیے جاتے ہیں۔کیونکہ وہ آنگریزوں کے ظلم وتشدد سے بہت زیادہ تنگ آجاتے ہیں۔ان کی نظروں میں چونکہ ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان کا خواب ہوتا ہے اس لیے وہ اس مقصد کی حصولیابی کے لیے کسی بھی قربانی کو گلے لگانے سے دریغ نہیں کرتے۔وہ ملک کی قربانی کے لیے اپنی راتوں کا آرام اور دن کا سکون چھوڑنے میں ہی راحت محسوس کرتے ہیں، جنگلوں میں رہ کر انگریزوں کے خلاف محاذ کھڑا کرنا ان کا مشغلہ سا بن جاتا ہے اور حکومت کے تئیں اپنی نفرت کا ثبوت پیش کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ریحان الدین احمد اس ناول کا ہیرو ہے جو اس حب الوطن دہشت پسند تنظیم کا رہنما ہوتا ہے اور اس کام میں بہت سارے ساتھی اس کے حکم کے تابعدار ہوتے ہیں ۔دیپالی سرکار اس ناول کی ہیروائن ہے اور اس ناول کا سب سے اہم کردار بھی۔ریحان الدین احمد اور دیپالی سرکار کو اس ناول میں مرکزیت حاصل ہے یہ دونوں کردار اپنے مقاصد کو بہ زورِ طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کا آغاز وہ بڑے جوش وخروش سے کرتے ہیں لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس تحریک سے وابستہ تمام افراد میں ضعف آجاتا ہے ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور وہ حالات سے سمجھوتا کر بیٹھتے ہیں۔بجز دیپالی سرکار کے باقی سارے کردار کسی نہ کسی وجہ سے اپنے نظریئے سے ہٹ جاتے ہیں۔

ریحان الدین اس ناول کا ہیرو ہے اور اپنی تنظیم کا رہنما اور سب کا آئیڈیل بھی ہے۔اس کی زندگی میں بہت سارے اُتار چڑھاو آتے ہیں لیکن وہ سارے مشکلات کو دل سے لگا کر اپنے مقصد کے حصول کے لئے سینہ تان کر تیار رہتا ہے وہ عین خوشحالی کے زمانے میں گھر سے چلا جاتا ہے اور آنگریزوں کے مقابل میں کھڑا ہوتا ہے۔وہ اپنی منگیتر 'جہاں آرا' کو اس لئے چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی رفاقت اس کو اپنے مقصد کے حصول سے روک لیتی۔ذیل کی عبارت سے یہ بات اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے:۔

> ''مجھے اس سے محبت تھی مگر کوئی جنون خیز عشق نہیں تھا۔وہ میرے لئے ایک پُر سکون سی چیز تھی مجھے ہمیشہ یہ معلوم رہتا تھا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں کسی حالت میں ہوں کیسی کٹھن مسافت طے کر کے لوٹوں، وہ سایہ دار درخت اور میٹھے پانی کے

کنویں کی طرح میری منتظر ہوگی''۔ [۲۲]

تنظیم میں کام کرتے ہوئے دیپالی سرکار اور ریحان الدین میں فکری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ریحان الدین، دیپالی سرکار کو اپنے رشتے کی تمام تر پیچیدگیوں سے آگاہ کرتا ہے اور تحریک کی کامیابی کے حوالے سے دونوں ایک دوسرے کی رفاقت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ ریحان کی ملاقات اس ناول میں تیسری لڑکی سے اس وقت ہوتی ہے جس وقت وہ لندن میں ہوتا ہے۔ اومارائے جو کہ ڈھاکہ کے بیرسٹر پری توش رائے کیمونسٹ کی بیٹی ہوتی ہے۔ وہ اپنے دل میں ریحان کی کشش پاتی ہے اور ریحان کو پانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ ریحان کو دیپالی کی طرف راغب دیکھ کر اومارائے، ریحان الدین کو دیپالی سرکار سے بدگمان کرتی ہے جس کی وجہ سے دونوں الگ ہو جاتے ہیں۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ ریحان الدین اور دیپالی سرکار کی فکری ہم آہنگی میں تحریک کی کامیابی پنہاں ہوتی ہے جب وہ اومارائی کی بدگمانی کی وجہ سے منتشر ہو جاتے ہیں تو تحریک خود بہ خود ناکامی کا شکار ہو جاتی ہے۔ غرض وہ سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں جو اس تحریک کے افراد نے دیکھے تھے۔ ریحان الدین تحریک کی ناکامیابی کے چلتے حالات سے سمجھوتا کر کے اپنی تمام تر محنت وقربانی پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اس نے اس مقصد کے لئے اگر چہ بچپن کے پیار 'جہاں آرا' سے لے کر ان گنت مشکلوں کو سینے سے لگایا ہوا تھا لیکن عین وقت پر صبر کا دامن چھوڑ کر شکست تسلیم کرتا ہے اور ارجمند منزل میں نواب قمرازماں چودھری کے وارث کی حیثیت سے سکونت پزیر ہوتا ہے۔

ناول کا اہم کردار دیپالی سرکار ہے وہ ڈھاکہ کے ایک متوسطہ گھرانے کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے وہ وطن کے لئے ہمیشہ قربان ہونے کے لئے تیار رہتی ہے جب ریحان الدین، دیپالی سرکار کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو اس کی بیوفائی دیپالی سرکار کو بہت صدما پہنچاتی ہے اسی اثنا میں اس کو اپنے گھر 'چندر گنج' کو چھوڑ کر کلکتہ ہجرت کرنا پڑتی ہے لیکن یہاں بھی اس کو سکون میسر نہیں آتا اور وہاں سے بھی ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ آخر کار گھر والوں کے ساتھ ہجرت کر کے ویسٹ انڈیز پہنچ جاتی ہے جہاں اس کی شادی عمر دراز بیرسٹر للت موہن سین سے ہو جاتی ہے اس طرح حرکیت سے پُر اس لڑکی کو زمانے کے سرد و گرم کا سامنا کر کے آخر کار اپنے فطری رجحان کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑھتا ہے۔ ویسٹ انڈیز سے ایک بار جب وہ اپنے ملک

آتی ہے تو اپنے ہی ملک میں خود کو اجنبی پاتی ہے۔شدید بے گانگی اور جلا وطنی کا غم لئے ہوئے واپس لوٹنے کا ارادہ کرتی ہے۔اظہارِ افسوس کے اس حال میں اس کے پاس چند الفاظ کے سوا کچھ نہ ہوتا ہے جو وہ ریحان الدین سے سوالیہ انداز میں کہتی ہے:

> ''ریحان تم نے۔۔۔تم نے اتنے شرمناک سمجھوتے کیسے کر لئے۔کلکتہ میں بھی اور یہاں بھی، وہ غم و غصے سے جھلا کر رہ گئی۔سمجھوتا کیا تم نے نہیں کیا۔تم نے پوٹ آف اسپین میں سمجھوتا نہیں کیا۔میں نے اپنا ضمیر نہیں بیچا''۔[۲۳]

ریحان الدین اور دیپالی کے بغیر یاسمین بیلمنٹ کا کردار اس ناول کا ایک اہم کردار ہے(یاسمین بیملٹ اپنے زمانے کا مشہور بن جائے گا لیکن وہ ایسے میرے دل میں پہنچ جاتا ہے کہ دل اُکتا جاتا ہے)۔یاسمین بیملٹ یوں تو ایک کٹر مسلم گھر سے تعلق رکھتی ہے مگر اس کو اپنے بڑے بڑے خوابوں کی تکمیل کے لئے ہجرت کرنا پڑتی ہے۔اس کے خواب تو خیر پورے نہیں ہوتے لیکن اس چکر میں ہوٹلوں میں آیا گری کرنا پڑتی ہے۔وہ جس تیزی سے ترقی کرتی ہے اسی تیزی سے وہ زوال کی طرف چلی جاتی ہے اور آخر کار ہر طرف سے مایوسی، ناکام اور ہراساں ہونے کے بعد خودکشی کر لیتی ہے۔نیلم فرزانہ اپنی کتاب 'اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار' میں رقمطراز ہیں:

> ''یاسمین مجید کی عسرت انگیز زندگی، اس کی خودکشی اور پھر اس کی یاد میں جشن دراصل اس پورے سلوک پر طنز ہے جو برِ صغیر میں آرٹسٹوں سے برتا جاتا ہے۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں اکثر اس حقیقت کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔''[۲۴]

ان تمام تر واقعات اور حادثات پر جب ہم مجموعی نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات اخذ کرتے ہیں کہ انگریزوں نے ۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال سے ہی دو قوموں کے بیچ میں سیاسی نفاق کی بنیاد ڈالی تھی جس سے متحدہ ہند تقسیم در تقسیم ہوا، پھر زبان اور کلچر کے افتراق نے اس مسئلے میں مزید اضافہ کیا جو برصغیر کی تقسیم ثانی کا ایک اہم سبب بنا۔قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے ذریعے سے یہ بات بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ بنگال کے لوگ اپنی زبان سے غایت درجے کی محبت رکھتے تھے۔وہ بنگالی زبان اور کلچر کے دلدادہ تھیں جو اس کلچر اور زبان کو اپنے دل و جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔موصوفہ نے اس بات کو چودھری قمر الزماں اور

دیپالی سرکار کے مابین گفتگو کے ذریعے سے کچھ یوں بیان کیا ہے:

''میں دوسرے صوبہ کے متعلق تو نہیں جانتی کا کا مگر ہمارے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا کلچر تو بالکل ایک ہے۔مانتا ہوں بھائی۔۔۔یہاں کا کلچر ایک ہے۔یہاں کی لوک سنگیت،لوک ساہتیہ، ہر چیز میں مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔مگر ہندووں نے کبھی اس کا اعتراف کیا؟ بنگالی کلچر سے ان کی مراد محض ہندو ہمدو بنگالی کلچر ہوتی ہے۔بنگلہ مسلمانوں کی زبان ہی نہیں بنگلہ ادب اور تہذیب صرف ہندووں کا ورثہ''۔ [۴۵]

دراصل جب برصغیر کی پہلی تقسیم پاکستان کے روپ میں ہوئی جہاں پر اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا تو بنگال کلچر اور بنگلہ زبان کے حامی مسلمانوں کو فکر لاحق شروع ہونا ہوئی کہ ہماری زبان اور تہذیب کا کیا ہوگا جس کی وجہ سے تحریکِ قیامِ بنگلہ دیش کو تقویت مل گئی اور اس طریقے سے برصغیر تقسیم در تقسیم ہو گیا۔

ناول "بانو" رضیا بھٹ:

ناول "بانو" رضیہ بھٹ کا ایک معروف ومقبول نام ہے جس کے کینوس میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۸۲ء کے متحدہ اور منقسم برصغیر کے معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی احوال و کوائف مندرج ہیں۔ناول ''بانو'' تقسیم کے حوالے سے رضیہ بھٹ کا ایک شاہکار ناول ہے۔موصوفہ نے بڑی ہی غیر جانبداری اور حقیقت بیانی سے تقسیم کے پسِ منظر اور پیشِ منظر کو عیاں و بیاں کیا ہے۔میرے خیال میں یہ تقسیم کے حوالے سے سب سے اہم اور حقائق کے سب سے زیادہ قریب ہے۔اس ناول میں موصوفہ نے فن کے ساتھ ساتھ موضوع کو اس طرح سمویا ہے کہ ہر کوئی قاری داد دیئے بغیر نہیں رہتا۔۳۸۴ صفحات پر مشتمل رضیہ بھٹ کا یہ ناول تقسیم کے حوالے سے حالیہ ناول ہے مگر اس کو پڑھتے ہوئے اس دور کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھیر جاتی ہے۔جن حالات و واقعات سے اس دور کے لوگوں کو منجملہ طور پر سابقہ پڑا تھا۔

ناول 'بانو' میں مصنفہ نے مشترکہ تہذیب، فسادات اور قیامِ پاکستان پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

پہلے دور میں مشترکہ تہذیب پر بات کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ کر اس کے بیشمار فوائد پر بات کی ہے۔ دوسرے حصے میں تقسیم کے بعد رونما ہونے والے فسادات کا احاطہ کرتے ہوئے تقسیم کے بعد دو نئے ملکوں کے درمیان آنے جانے والے قافلوں کے آپسی مظلم سے آگہی پیش کی ہے۔ مہاجروں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا گیا اور محض مذہب اور دھرم کے نام پر جو ظلم وستم ڈھائے گئے ان حالات کی خوب تصویر بھی اس حصے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ تیسرے حصے میں تقسیم کے بعد قیامِ پاکستان کا تذکرہ کیا ہے جس میں انہوں نے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان جس مقصد کے لئے وجود میں آیا تھا وہ مقصد پورا نہیں ہوا۔ وہاں پر بھی وہیں نظام جاری رہا جس سے چھٹکارا پانے کے لیے لوگوں نے قربانیاں دیں تھیں۔

بانو کے بنیادی قصے کا مرکز لدھیانہ پنجاب ہے جہاں پر معراج الدین ، کے ساتھ ساتھ نصیرالدین، لالہ گوپی ناتھ اور مہندر سنگھ مشترکہ تہذیب سے پُر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ ناول نگار نے مشترکہ تہذیب پر کچھ یوں گوہرافشانی کی ہے:

> ''ہندو مسلم بڑے سلوک اور اتفاق سے رہتے تھے۔ معراج الدین اور نصیرالدین کی دوستی ہندواور سکھوں سے بھی تھی۔ لالہ گوپی ناتھ اور ایشور سنگھ سردار مہندر سنگھ سبھی ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے جب سب اکٹھے ہوتے تو رات کے بارہ بارہ بجے تک گپ شپ کی محفل جما کرتی تھی۔ بھائی چارہ اتنا تھا کہ ایشور سنگھ کی بیٹی کی برات آئی۔ تو نصیرالدین نے ساری بارات کو دودھ پلایا تھا۔'' [۲۶]

معراج الدین کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑا بیٹا عبدالرحیم جالندھر میں کپڑے کی معمولی دکان چلا رہا ہوتا ہے کام کے چلتے اس کا مالک اسے جالندھر ہی بلا لیتا ہے۔ دوسرا بیٹا عبدالکریم لدھیانہ میں ملازمت کرر ہا ہوتا ہے۔ بڑی بیٹی رشیدا کی شادی بٹھنڈا میں ہوئی تھی اور جس کا شوہر انجینئر تھا لیکن شادی کے ایک سال بعد ہی اس کا شوہر دارفانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد سُسرال والوں کی نیت بدل جاتی ہے اور اس پر مظالم کے پہاڑ توڑ دئے جاتے ہیں۔ اس کی جائیداد ناجائیز طریقے سے ہتھا لی جاتی ہے اور اس کو خالی ہاتھ گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ رشیدا کی ایک چھوٹی بہن ثریا ہوتی ہے جس کو وہ اپنی بچی کی

طرح پالتی ہے۔حسن، رشیدا کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے جس کو وہ اپنے شوہر کی طرح انجنیئر بنانا چاہتی ہے۔ معراج الدین کے مقابلے میں نصیرالدین کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہوتی ہے۔بیٹوں میں سلیم،فہیم،نعیم اورندیم ہوتے ہیں اوراکلوتی بیٹی کا نام بانو ہوتا ہے۔سب سے بڑا بیٹا سلیم کانگریسی ہوتا ہے۔فہیم،سلیم سے چھوٹا ہوتا ہےاور لیگ کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔فہیم کے بعد بانو ہوتی ہےاس کے بعد دواور بیٹے نعیم اورندیم ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں سے لال گوپی ناتھ اورمہندرسنگھ اس مشترکہ تہذیب کے اول دور میں نمائندے بن کر سامنے آجاتے ہیں جن پر مصنفہ نے ناول کا پلاٹ بنا ہے۔حسن،سلیم اور بانو اس ناول کے تین سب سے اہم کردار ہیں۔مصنفہ نے کانگریس اورمسلم لیگ کے درمیان ہونے والی رسہ کشی کی تصویران ہی کے ذریعے سے دکھائی ہے۔حسن جو کہ رشیدا کا بیٹا ہوتا ہےاور جس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہوتا ہےاس ناول کا اہم کرداراور ہیرو بن کر سامنے آتا ہے۔وہ مسلم لیگ کا حامی اور فعال رکن بھی ہوتا ہے۔وہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک کا حامی ہوتا ہےاورمحمد علی جناح کے خاص رفیقوں میں شمار ہوتا ہے۔

کانگریس کے ایک فعال رکن ہونے کی حیثیت سے سلیم ہمیشہ قیامِ پاکستان کی مخالف کرتا رہتا ہے۔وہ گاندھی جی کی فکر سے متاثر ہوتا ہےاور قیام پاکستان کومشترکہ تہذیب کی موت سے تعبیر کرتا ہے۔ سلیم کی چھوٹی بہن''بانو''اس ناول کی ہیروئن ہےاوراس ناول کی سب سے اہم کردار بھی ہے جس پراس ناول کے حالات وکوائف کوترتیب دیا گیا ہے۔مصنفہ نے اس ناول میں تقسیم اورتقسیم سے پیش شدہ واقعات کوحسن اور بانو کے والہانہ محبت کے ذریعے سے قارئین تک بڑے ہی درد بھرے اسلوب میں بیان کیا ہے۔

لدھیانہ کےاس پرفضا ماحول کے ذریعے سے مصنفہ نے یہ بات باورکرانے کی کوشش کی ہے کہ متحدہ ہند میں سارے مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کےغم اورخوشی میں شریک ہوتے تھے۔کامنی چاچی کی رشیدہ کے گھر میں ہمیشہ موجودگی ہندومسلم تعلقات کوخوب عیاں کرتا ہے۔تہواروں پر ہندو مذاہب کےلوگوں کی مسلمانوں کی طرف سے حوصلہ افزائی اور ہندوؤں کے تہواروں پرمسلمانوں کی خوشی منانا دراصل سالہا سال چلتی آرہی مشترکہ تہذیب کی طرف اشارہ ہے۔ جہاں پرسارےلوگ خوشی اورغمی

ایک ساتھ مناتے تھے یہاں تک کہ ماتم میں بھی دونوں مذاہب کے لوگ برابر کے شریک ہوتے۔اس دور میں مکان تنگ ضرور تھے مگر لوگوں کے دل بہت وسیع ہوا کرتے تھے اس کے مقابلے میں جب ہم آج کل اپنے سماج کی طرف اک طائرنہ نظر دوڑاتے ہیں تو سب کچھ اُلٹا ہی پاتے ہیں۔آج کل اگرچہ لوگوں کے مکان وسیع وعریض ہوتے ہیں اور سہولت کے سارے ذرائع موجود ہوتے ہیں لیکن لوگوں کے دل مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ سکڑتے ہی جارہے ہیں۔غرض مصنفہ نے جس طرح سے مشترکہ تہذیب کو اپنے ناول میں برتا ہے اس چیز سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ مشترکہ تہذیب سے ہر طرف لوگوں کے لئے سکون ،اطمینان اور انبساط سے پُر زندگی میسر تھی جہاں پر انسان سچ میں اشرف المخلوقات درجے کے قابل تھا۔ لیکن جونہی ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان نظریاتی اختلاف زور پکڑنے لگے تو زندگی ہر طرف مخدوش ہونے لگی اور ہر کسی کو جینے کے لالے پڑنے شروع ہوگئے۔برصغیر کے سیاسی منظرنامے کا اثر براہ راست لوگوں کی عملی زندگیوں پر پڑھ رہا تھا،لوگ نظریاتی گروہ بندی کے شکار ہورہے تھے اور آپس میں نفرت کا بھیج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کررہا تھا۔ایک طرف کانگریس کے کاری کردہ جے جے ہا کار مچانے میں مست تھے دوسری طرف مسلمان پاکستان کے لئے مرکھپ جانے کے لئے ہر وقت تیار تھے۔موصوفہ نے پاکستان کے حامیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مسلم قوم حرم کی پاسبانی کے لئے مسلم لیگ کے ہلالی پرچم تلے جمع ہوچکی تھی اور خیبر سے چاٹگام اور کشمیر سے راس کماری تک ایک ہی نعرہ گونج رہا تھا 'لے کے رہیں گے پاکستان' یہ صرف ایک نعرہ ہی نہیں تھا۔ایک قوم کا عزمِ جہاد تھا۔اس قوم نے اپنے وجود کا سراغ لیا تھا اور ایک صدی کی غلامی کے بعد وہ زنجیریں جھٹک کر اُتار پھینکنے کو تیار ہوگئیں تھیں،جو اسے پہنائی گئیں تھیں۔اور ملت کا پاسبان وہ نحیف سا انسان جسے اقبال کی چشمِ بینا نے پرکھ رکھا تھا۔یہ مردِ آہن محمد علی جناح تھا''۔ [۲۷]

مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہر چڑھتے سورج کے ساتھ نظریاتی خلیج بڑھتی جارہی تھی۔کیبنٹ میشن(cabinet mission) کے ناکام نتائج نے اس میں جلتے پر تیل کا کام کیا۔محمد علی جناح نے اُنہیں حالات میں Direct Action Plan پر عمل کر کے براہِ راست پاکستان کی مانگ کی،بدترین

فسادات نے جنم لینا شروع کیا کچھ ہی دنوں میں برصغیر کا نقشہ ہی تبدیل ہو گیا۔مشترکہ تہذیب، بھائی چارہ اور آپسی محبت و اخوت کا جنازہ نکل گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں ماؤں، بیٹیوں کی عصمت تار تار کر دی گئی۔اشرف المخلوقات کے لقب سے نوازا ہوا انسان آج اپنے اعمال سے درندوں کو بھی شرمسار کر رہا تھا۔کل تک جو مسلم بہن، ہندو بھائی کے ہاتھ پر راکھی باندھتی تھی آج وہیں ہاتھ اس کی عصمت لوٹنے پر اُٹھ رہے تھے۔کل تک جس مشترکہ تہذیب کی شان میں قصیدے پڑھے جا رہے تھے آج لوگ اپنے اعمال و افعال سے اسی مشترکہ تہذیب کا خون کر رہے تھے۔وقت کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل چکا تھا۔ ہندوؤں کو ہندوستانی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور مسلمانوں کو پاکستان کے سوا۔ پورے ملک میں جہاں دنگے، فساد ہو رہے ہوتے ہیں وہیں حسن اور سلیم کے درمیان بھی نظریاتی اختلاف بڑھ جاتے ہیں۔نظریاتی اختلاف کی وجہ سے ان کی دوستی دشمنی میں تبدل ہو جاتی ہے۔حسن اور سلیم کے درمیانا اسی تناظر میں بہت بار ہاتھا پائی بھی ہوتی ہے۔سلیم حسن کو اپنے دو ہندو دوستوں راجندر سنگھ اور گیان سے بڑی بے دردی کے ساتھ پٹوا تا ہے اور پکے کانگریسی ہونے کا پکا ثبوت پیش کرتا ہے۔غرض دونوں کے درمیان بہت زیادہ نظریاتی خلیج بڑھ جاتی ہے۔حسن بار بار سلیم کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ مسلمان آزاد ہندوستان میں محفوظ نہیں رہیں گے۔ہم انگریزوں کی غلامی سے نکل کر ہندوؤں کی غلامی میں آ جائیں گے اور ہندوؤں کی طرف سے ہم پر ہمیشہ مظالم ڈھائے جائیں گے۔لیکن سلیم، حسن کی ایک نہیں سنتا اور اپنے نظریئے پر ڈٹا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ثریا کو حسن کے گھر جانے سے بھی روکتا ہے تا کہ وہ بھی مسلم لیگ کی حامی نہ بن جائیں اور اپنی بہن بانو جو کہ حسن سے بیحد پیار کر رہی ہوتی ہے کو بھی حسن کے گھر جانے سے روکتا ہے۔

سلیم اور حسن میں نظریاتی اختلاف اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سلیم اپنی بہن کا رشتہ حسن کے بجائے اپنے ہندو دوست راجندر سنگھ کے ساتھ کرانے پر بھی رضا مند ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں یہ دلائل پیش کرتا ہے کہ شادی کے بعد دونوں اپنے اپنے مذہب پر رہیں گے۔لیکن پورے احتجاج کے باوجود بھی سلیم اپنی بات باپ کے سامنے منوانے میں ناکام و نامراد ہی ہ رہتا ہے اور آخر کار بانو کی منگنی حسن سے ہی کی جاتی ہے اور شادی کی تاریخ بھی طے پاتی ہے لیکن تقسیمِ ملک اور بدترین فسادات کی وجہ سے یہ شادی پھر کبھی

انجام کونہیں پہنچ پاتی۔منگنی کے بعد ہی حسن کونوکری کے سلسلے میں راولپنڈی جانا پڑھتا ہےاور پانچ مہینے بعد وعدے کے مطابق لوٹ جانا ہوتا ہےلیکن حالات وواقعات ایک الگ ہی کروٹ لے لیتے ہیں۔اسی دور میں تاریخ کے وہ بدترین فسادات رونما ہوئے جن کی سنگینیت کی مثال آج بھی دی جاتی ہے۔فسادات میں دونوں اطراف سے جانوں کا اتنا زیاں ہوا کہ سنتے ہی انسان حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں رہ رہے ۲۵ فی صدی مسلمانوں کی شرح گھٹا کر کے ۹ فی صد تک لائی گئی۔اسی طریقے سے بہت سارے ہندوؤں کو بھی قتل کیا گیا۔فسادات کا سب سے بڑاالمیہ یہ رہا کہ اس میں دوستی اور دشمنی کے بلبوتے پر قتل و غارتگری نہیں ہو رہی تھی بلکہ مذہب کے بلبوتے پر یہ سب کچھ انجام دیا جا رہا تھا۔ یہ بات تاریخی حقائق و دلائل سے ثابت ہے کہ مذہب اگر اس سب کے پیچھے نہ ہوتا تو ان مسلمانوں کا قتلِ عام نہ کیا جاتا جو کانگریس کے حامی اور آراکین میں شامل تھے جنھوں نے کانگریس کے لئے ہرطرح کی قربانی دی تھی۔ان حالات کی نمائندگی کی پیشکش مصنفہ نے ناول میں سلیم کے کردار سے کی ہے جو کہ کانگریس کا مسلم رکن ہوتا ہےاور کانگریس کی محبت میں ہرکوئی مسلم دشمن اقدام بھی کرتا ہےلیکن پھر بھی وہ فسادات کی نذر ہو جاتا ہے نہیں کر گذرتا ہے ۔اس کو آخر میں اپنی تحریک کے لوگ ہی فسادات میں اپنی بیوی اور پورے خاندان سمیت بے دردی سے مار دیتے ہیں۔

"بانو" خاندان میں وہ واحد لڑکی ہوتی ہے جوفسادات کے المناک اورنمناک واقعات کے بعد بھی کسی طریقے سے زندہ رہنے میں کامیاب رہتی ہے۔فسادات کے تمام مظالم سہہ کر وہ مہاجروں کے ساتھ پاکستان کی رہ لیتی ہے مگر مہاجرکیمپ پر بلوائیوں کے حملے کے نتیجے میں اس کو'بسنت سنگھ' نامی ایک غنڈا پکڑ کر لاتا ہےاور زبردستی اس کے ساتھ شادی کرتا ہے۔بسنت سنگھ، بانو پر ہرطرح کے مظالم ڈھاتا ہے یہاں تک اس کا مذہب بھی بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور سکھ کے طور پر اس کا نام ''سندر کور'' رکھتا ہے ۔جس میں وہ بہرحال ناکام رہتا ہے۔بانو اس ناول میں ان لڑکیوں کی آئینہ دار ہے جو تقسیم برصغیر کے المیے کی سب سے بڑی شکار ہوئیں لیکن پاکستان دیکھنے کی امید نے انہیں زندہ رہنے پر مجبور کیا۔اس جیسی لڑکیاں تقسیم سے پہلے سب کی پسندیدہ ہوا کرتی تھیں لیکن تقسیمِ برصغیر کے المیے کے ساتھ ہی ان پر مظالم کے اتنے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ یاد رکھنے کے لئے لوگ کم پڑھ گئے۔ بانو اور اس جیسی ہزاروں مسلمان عورتیں

تقسیم کے لئے قربان ہو گئیں۔انہوں نے موت سے بھی سخت مظالم کو صرف اس لیے سہا تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی قربانیوں کا ثمرہ دیکھیں۔ یہ قربانیاں معمولی نہ تھیں۔ان قربانیوں نے لوگوں سے جیتے جی سب کچھ اچک لیا تھا اور باقی اگر کچھ بچا تھا تو وہ صرف خالی ڈھانچہ۔اس حقیقت کا اعتراف حسن کا بانو کو پانچ سال بعد دیکھ کر اندرونی چیخ وپکار سے ہوتا ہے:

''کاش تم مر گئیں ہوتیں بانو۔کاش تم مر گئیں ہوتیں۔''وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔''تمہارے مر جانے کا صدمہ قابلِ برداشت تھا۔لیکن یہ زندہ رہنے کا سانحہ کیوں کر برداشت کرلوں۔تمہیں بانو سمجھ کر خوشی سے قہقہے لگاؤں۔یا 'بانو' کی لاش سمجھ کر لپٹ لپٹ کر روؤں۔

باہر اماں بین کر رہی تھیں۔محلے کی کچھ عورتیں آواز سن کر آ گئی تھیں۔بانو کو گھیرے میں لئے سب آنسو بہا رہی تھیں۔زور اندر حسن رو رہا تھا۔وہ حسن رو رہا تھا۔

جو آنسوؤں کو شیوہ مردانگی نہیں گردانتا تھا۔

اور جو بانو کے مرنے کی خبر پا کر بھی نہیں رویا تھا۔

آج زندہ بانو پر آنسو بہا رہا تھا۔

تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا۔بلک بلک کر آنسو بہا رہا تھا۔'' [۲۸]

فسادات کے پانچ سال میں بانو پر کیا کچھ بیتی تھی وہ بانو کی شکل وصورت سے صاف عیاں ہو رہا تھا۔بسنت سنگھ نے پہلے اس سے زبردستی شادی کی،اس کو سکھ بنانا چاہا تھا،زبردستی سے اس کا نام بانو سے سندر کور رکھا تھا اور کیا کچھ نہیں کیا ہوتا ہے جس سے ایک انسان زندہ لاش بن کر پھرتا رہتا ہے۔دراصل ''رضیہ بھٹ'' نے اس ناول میں 'بسنت سنگھ' کے کردار کے ذریعے سے اس دور کے ان سکھوں اور بلوائیوں کی نمائندگی کی ہے جنہوں نے مسلم لڑکیوں کو بندھک بنا کے ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ان میں اکثر لڑکیاں اگرچہ ظلم سہتے سہتے مر گئیں لیکن ان میں سے کچھ پاکستان دیکھنے کے شوق میں زندگی بسر کرتی رہیں اور ظلم وستم کے یہ دن اسی آس میں بتاتی رہیں۔پاکستان ایک طرف جہاں تمام مسلمانوں کو جان سے بھی عزیز تھا اور ساری قربانیاں اسی کے قیام کے لئے دی گئیں تھیں تا کہ ان تمام چیزوں سے بچا جائے جن کو ہندستان میں ان کو جھیلنا پڑھ رہا تھا۔لیکن وہ خواب کبھی پورا نہ ہوا۔نیا ملک اسلامی جمہوریہ کے

نام سے وجود میں تو آ گیا مگر وہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا جس کے لیے لوگوں نے قربانیاں دیں تھیں۔وہ خواب، خواب ہی رہا اور اب تک وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پایا۔بانو کے ذریعے سے ''رضیہ بھٹ'' نے دکھایا ہے کہ پاکستان جن اساسوں پر قائم ہوا تھا وہ صرف ساخت تک محدود رہے اور عملی صورت اختیار کرنے سے قاصر ہے۔مرکزی کردار ''بانو'' کے ذریعے سے موصوفہ نے جہاں بہت ساری باتیں نمایاں کیں ہیں لیکن ان میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان جن بنیادوں پر تعمیر ہوا تھا وہ مقصد کبھی پورا نہیں ہوا۔علامہ اقبال اور محمد علی جناح نے جو بلند بانگ دعوے کئے تھے وہ صرف دعوے ہی رہے اور پورے نہ ہوئے۔مسلمانوں کو ہندوستان میں جو خدشات وخطرات لاحق تھے وہ ہجرت کے ساتھ ہی پاکستان بھی پہنچ چکے تھے۔جس کی منظر کشی مصنفہ نے ذیل کی عبارت میں کی ہے:

''تم۔۔تم۔۔کون ہو۔بسنتا تو بھارت میں ہے۔تم تو مسلمان ہو''۔بانو آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔''تم نے مجھے بانو بہن کہا تھا''۔
داؤد نے پھر قہقہہ لگایا۔بانو کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔
بانو کو یوں لگا۔جیسے بسنتے نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔اس نے چیخنا چاہا۔لیکن سر کو جھٹکا دیتے ہوئے پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔
''تم۔۔تم تو مسلمان ہو۔سکھ تو نہیں۔یہ پاکستان ہے نا''۔
''ہاں۔۔۔ہاں'' داؤد نے ہنستے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچا۔بانو تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔''تم مجھے کیوں کھینچ رہے ہو۔تم سکھ تو نہیں مسلمان ہو میں تمہاری ماں ہوں' بہن ہوں' بیٹی ہوں۔مجھے چھوڑ دو۔مجھے چھوڑ دو۔تم ماں بہنوں کی آبرو پر کٹ مرنے والے ہو۔مجھے کیوں پکڑ رہے ہو۔میں تمہاری تیرہ تیرہ ناموس ہوں۔لٹی ہوئی آبرو ہوں۔مجھ پر ہاتھ رکھ کر تم نے انتقام کی قسمیں کھانا ہیں۔تم یہ کیا کر رہے ہو۔کیا۔۔کر رہے ہو۔چھوڑ دو۔۔چھوڑ دو۔۔میں تمہاری بہن ہوں۔میں تمہاری بہن ہوں''۔[۲۹]

اوپر الزکر تمام خواتین تخلیق کاروں کی تخلیقوں کا تقسیم کے حوالے سے تجزیہ کر کے یہ بات اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ خواتین تخلیق کار بھی فن کے ساتھ ساتھ موضوع کے بیان کی پیچیدگیوں میں طرۂ امتیاز

رکھتی ہیں۔متذکرہ ناول نگاروں نے اپنے احساس وجذبات کوقلم کی نوک کے ذریعے سے صفحوں کے صفحے صفحۂ قرطاس پرلکھ ڈالے ہیں اور گویا ڈاکٹر سید جاوید اختر کی اس بات کو غلط ثابت کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں(کہ مردوں کی طرح ان کی یعنی عورتوں کی تحریروں میں جذبات واحساسات کی وہ رو دکھائی نہیں دیتی جسے ہم اعلی درجے کی حقیقت نگاری،عینیت اور واردات ذاتی سے تعبیر کرسکیں)(اردو کی ناول نگار خواتین ص۲۰۹)۔اور اس بات کو بھی (کہ صرف مرد ادیبوں نے ہی اپنے کرداروں پر ظلم وتشدد ہوتے ہوئے مکمل جذیات کے ساتھ دکھایا ہے خواتین کے ہاں عموماً ایسی تفاصیل نہیں ملتے) (اردو کی ناول نگار خواتین،ص ۲۰۹)۔

تینوں فن کاروں کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا بار بار ادراک ہوتا ہے کہ ان کی ہر کوئی تخلیق ان کے احساسات، جذبات اور تجربات کی ترجمان ہے۔انہوں نے نہ صرف احساسات و جذبات کوقلم کی روشنائی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچایا ہے بلکہ بہت سارے مرد ادیبوں سے بڑھ کر حقیقت نگاری،عینیت اور واردات قلبی اور خارجی کو پیش کیا ہے۔ان کے ناولوں میں حقیقت نگاری کی اعلی مثالیں مل جاتی ہیں جو بہت سارے مرد ادیبوں کے ہاں مفقود ہیں۔اوپرالذکر ناول ایسے معرکتہ لآرا ہیں جن کو پورے برصغیر میں تقسیم کے حوالے سے پذیرائی مل چکی ہے اور بہت سارے ادبی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔متذکرہ ناول نگاروں کے ناولوں سے یہ بات بھی مترشع ہو جاتی ہے کہ انہوں نے مرد ادیبوں کی ہی طرح ظلم وتشدد ہوتے ہوئے مکمل جذیات کے ساتھ دکھایا ہے بلکہ کہنا تو یہ چاہیے کہ بعض خواتین تخلیق کاروں نے مردوں سے بھی بڑھ کر ظلم وتشدد کی تفاصیل دی ہے جن میں قرۃالعین حیدر اور حال کی ناول نگاروں میں رضیہ بٹ کا نام قابل مطالعہ ہے۔ان دونوں فن کاروں نے تقسیم کے المیے کو چونکہ خود جھیلا اور برداشت کیا ہے اس لیے ان کے ناولوں میں بھی ظلم وتشدد اپنے پورے کرب اور الم ناک صورت حال میں سمٹ کر آیا ہے۔رضیہ بٹ نے تو اس حوالے سے تو ناول ''بانو'' میں سارے ادیبوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور تقسیم کے المیے کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ سچ میں حق ادا ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے اور حواشی

۱، (ایوانِ اردو دہلی، رسالہ ماہنامہ، مئی 1996ء، ص ۳۴)

۲، (''ایوانِ غزل'' جیلانی بانو، مطبوعہ ناولستان، جامعہ نگر، دہلی، ۱۹۷۶ص، ۱۳۶)

۳، (اردو ناول رویئے اور اسالیب، انور خان) بحوالہ، آزادی کے بعد اردو فکشن، مرتبہ ابوالکلام)

۴، (''ایوانِ غزل'' جیلانی بانو، مطبوعہ ناولستان، جامعہ نگر، دہلی، ۱۹۷۶ص، ۱۰۹)

۵، (ایضاً، ص ۳۳۴)

۶، (ایضاً، ص ۳۳۴)

۷، (قرۃ العین حیدر، آئینہ خانہ میں، نقوش، کراچی 1963ء بحوالہ ''ہندو پاک میں اردو ناول'' مصنفہ، ڈاکٹر انور پاشا، مطبوعہ، پیشرو پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۹۲ء ص ۴۷)

۸، (میرے بھی صنم خانے، قرۃ العین حیدر، مطبوعہ ادارہ یوسف، پبلشرز بینک روڑ راولپنڈی دسمبر ۱۹۴۷ء، ص، ۴۱۷)

۹، (فرقہ واریت اور اردو ناول، محمد غیاث الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ص، ۱۳۱)

۱۰، (سفینۂ غمِ دل، قرۃ العین حیدر،، مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ء ص ۳۴۸)

۱۱، (سفینۂ غمِ دل، قرت العین حیدر، مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ء، ص، ۳۰۲)

۱۲، (سفینۂ غمِ دل، قرۃ العین حیدر، مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ء ص، ۳۱۱)

۱۳، (ڈاکٹر محمد نسیم، اردو ناول پر تقسیمِ ہند کے المیے کے اثرات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ص، ۱۰۷)

۱۴، (آئینہ خانے میں" قرۃ العین حیدر، کتاب لکھنو، جنوری ۱۹۶۳ء، بحوالہ: قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری، مصنفہ شہنشاہ مرزا، لکھنو، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۱ء)۔

۱۵، (آگ کا دریا، قرۃ العین حیدر، مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۴ء ص ۵۵۳)

۱۶، (آگ کا دریا،قرت العین حیدر،،مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی۱۹۹۴ص۵۶۳)

۱۷، (آگ کا دریا،قرۃ العین حیدر،،مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی۱۹۹۴ص،۴۰۹)

۱۸، (’آگ کا دریا‘ قرۃ العین حیدر،،مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی۱۹۹۴ء،ص۶۲۵)

۱۹، (’آگ کا دریا‘ قرۃ العین حیدر،،مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی۱۹۹۴ء،ص۶۴۸)

۲۰، (’آگ کا دریا‘ قرۃ العین حیدر،،مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی۱۹۹۴ء،ص۶۵۹)

۲۱، (عبدالمغنی آخرِ شب کے ہمسفر ،مضمون مشمولہ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، ارتضا کریم، ص۳۴۵)

۲۲، (آخرِشب کے ہمسفر ،۱۹۷۹ء،علوی بک ڈپو،بمبئی،ص۲۵۸)

۲۳، آخرِشب کے ہمسفر ،۱۹۷۹ء،علوی بک ڈپو،بمبئی،ص،۱۰۷)

۲۴، (اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار،نیلم فرزانہ، براون پبلی کیشنز نئی دہلی،ص۱۴۹)

۲۵، (آخرِشب کے ہمسفر ،ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ،۱۹۹۸ء ص،۱۲۰)۔

۲۶، (ناول، بانو رضیہ بھٹ PDF۔ص،۸۱)

۲۷، (بانو،رضیہ بھٹ،PDF،ص،۸۷)

۲۸، (بانو،رضیہ بھٹ،PDF،ص۸۰)

۲۹، (رضیہ بھٹ،بانو،PDF،ص۸۱)

باب سوم

خدیجہ مستور کے ناولوں میں تقسیمِ برصغیر کا المیہ: نسوانی کرداروں کے حوالے سے

تقسیمِ ہنداورفسادات کے موضوعات پر آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ ابھی لکھنا باقی ہے کیونکہ یہ واقع برصغیر ہندوپاک کا وہ المیہ ہے جس پر جتنی وضاحتیں کی جائیں بہت کم ہوں گی۔ تقسیمِ ہند پر آج تک جتنا بھی لکھا جا چکا ہے اس کا خلاصہ یہی ہے کہ آگ اور خون کے اس سمندر میں لاکھوں انسانوں کی جانیں، لاکھوں عورتوں کی عصمتیں اور لاکھوں ماؤں کے جگر کے ٹکڑے بہہ گئے۔صدیوں سے جڑے رشتے، ناطے، عہدِ وفا، دوست داریاں سب کچھ ریت کا ڈھیر ثابت ہوئیں۔جن لوگوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں تھیں وہ ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔ایک طرف ہندوؤں نے یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ ایک بھی مسلمان کو ہندوستان میں رہنے نہیں دیں گے وہیں دوسری طرف پاکستان کے لوگ بھی اسی چیز کو دوہرا رہے تھے۔کیونکہ دونوں کے درمیان جس مشترکہ تہذیب سے سارے رشتے ناطے قائم تھے اس کا خاتمہ انہوں نے اپنے ہاتھوں خود کیا۔دونوں قومیں اب آپس میں دست وگریبان تھیں۔ان کی جنگ مذہب کی، انا کی اور سرحدوں کی جنگ تھی اوراس جنگ نے ان کو انسان کم بلکہ حیوان خصلت زیادہ بنا دیا تھا۔اس گراوٹ نے ان سے وہ حیا سوز، انسانیت سوز اور بہیمانہ افعال کروائے جن کے مطالعہ سے آج بھی روح کانپ جاتی ہے۔

تقسیم اورفسادات نے مشترکہ تہذیب کے ان تمام خوابوں کو چکنا چور کیا جو لوگوں نے مل کر آزادی کے تعلق سے دیکھے تھے۔متحدہ ہند کے عام لوگ ایک طرف انگریزوں کو اپنے دشمن سمجھ کر ان کو ملک بدر کرنا چاہتے تھے اوراس کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے دوسری طرف یہاں کے امراء الگ ہی پالسیاں مرتب کرنے میں مصروفِ عمل تھیں۔ان کی سوچ لوگوں کی سوچ سے کوسوں دور تھی۔ان کے دماغوں میں تقسیم کا بھوت سوار ہو گیا تھا اور تقسیم کے بغیر ان کے منہ چین نہیں پا رہے تھے۔انہوں نے کچھ اپنے مفاد اور کچھ مذہبی جنون میں جو فیصلہ لیا وہ متحدہ ہند کے لوگوں کے لئے مجموعی طور پر نا قابلِ قبول تھا۔اس فیصلے سے انہوں نے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے علاوہ اوران کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے علاوہ کوئی کارہائے نمایاں کام انجام کر کے نہیں دکھایا، کیونکہ بانٹنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا جبکہ جوڑنا مشکل ضرور ہوتا ہے۔اس فیصلے سے مسلمانوں کو اور نہ ہی ہندو قوم کو کوئی بڑا فائدہ آنے والا تھا۔اس جذباتی فیصلے

نے صدیوں سے ایک ہی ملک میں رہ رہے لوگوں کو پل بھر میں جانی دشمن بنا دیا۔ یہ جذباتی فیصلہ ایسے زخم دے گیا جو بعد میں ناسور سے بھی سخت مہلک ثابت ہوئے۔ برصغیر ہندو پاک ایک عذابِ مسلسل میں مبتلا ہو گیا۔ ایسے مسائل رونما ہوئے جس سے دونوں خطوں کی سا لمیت خاک میں مل گئی۔ لوگوں کی عزتِ نفس تو چھوٹی سی بات ہے لوگوں کے جان و مال کا اتنا زیاں ہوا کہ اس کا حساب لگانا بھی دشوار ہے۔ اس تقسیم کا اصل المیہ یہ نہیں ہے کہ صدیوں سے ایک ساتھ رہ رہے لوگ پل بھر میں الگ ہونے پر راضی ہوئے اور الگ الگ خطوں میں رہنے میں ہی عافیت تصور کرنے لگے۔ بلکہ اصل المیہ تو یہ ہے کہ لوگ جدا ہوتے وقت یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ آخر ہمارے جدا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ صدیوں سے ہم دو محبت کرنے والے مذاہب کے لوگ آخر کس پالیسی کے تحت الگ الگ کئے جا رہے ہیں؟ لیکن عین تقسیم کے وقت کسی نے اس بات کی الم نہ اُٹھائی اور ہر کوئی ایک سیلِ رواں کے ساتھ ہی ساتھ بہہ رہا تھا جو حدِ نگاہ تک کسی منزل سے خالی ہی نظر آ رہا تھا۔ بہر حال اس المیہ نے تمام خطے کی چیزوں کو اپاہج بنا کے چھوڑ دیا۔ فرنگیوں کی ''پھوٹ ڈالو حکومت کرو'' والی پالیسی نے ہر گھر کو ماتم کدہ بنا کے چھوڑا۔ سالہا سال سے بٹوری ہوئی مشترکہ وراثت کا پل بر میں قلع قمع ہوا۔ محبت اور انسیت کی ڈور سے جو رشتے صدیوں سے بندھے آ رہے تھے پل بر میں ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔ انگریزوں کی تربیت نے لوگوں کے اذہان میں ایسا زہر گھول دیا تھا کہ ہندو ایک طرف سے انہیں کو اپنا خیر خواہ مان رہے تھے اور مسلمانوں کو اپنا جانی دشمن سمجھنے لگے۔ اسی طریقے سے مسلمان بھی انگریزوں کی شاطر پالیسی کی وجہ سے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات روا رکھنے پر مجبور تھے اور ان ہی کی تربیت کے عین مطابق ہندوؤں کو دنیا کے بڑے جابر اور ظالم سمجھ رہے تھے۔ یہ بات تو کسی سے مخفی نہیں ہے کہ تقسیم ہند کے بعد برصغیر ایک جنگی اکھاڑا بن چکا تھا اسی طریقے سے یہ بات بھی ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ اس خونین کھیل کے پیچھے برصغیر کے کوتاہ نگاہ رہنماوں کے بعد سب سے بڑا ہاتھ انگریزوں کا تھا۔ انگریزوں نے ایک منظّم طریقے سے لوگوں کی ذہن سازی کی، جان بوجھ کر ایک طبقے کو دوسرے طبقے پر فوقیت دی۔ ایک کو عزت سے نوازا اور دوسرے کو رسوا کیا۔ گویا ذہن سازی کچھ اس انداز سے کی کہ ایک ہی گھر میں رہ رہے دو مختلف نظریات (

مسلم لیگ اور کانگریس) کے لوگ اس سے پہلے اگر چہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے لیکن انگریزوں کی پالیسی کی وجہ سے اس طرح کے سارے رشتے ناطے جانی دشمنی میں بدل گئے۔ وہ لوگ ایک باقاعدہ اور منظّم طریقے سے ایسے متنفر کئے گئے تھے کہ پرانی دوستیاں ان کو اس بدترین کام کے کرنے سے عاجز نہیں کر پا رہی تھیں۔ بہت کم وقت میں دونوں قومیں آپس میں ایسے دست و گریباں ہو گئیں جیسے کبھی عرب کے اوّس اور خزرج کے دو قبیلے ہوا کرتے تھے اور ایک ایک جنگ سالوں تک لڑتے تھے۔ انگریزوں کی سازش اتنی سنگین اور مستحکم تھی کہ برصغیر کا کوئی بھی رہنما ان کی اس پالیسی کا توڑ نہ کر پایا، اگر ان کی اس شاطرانہ پالیسی کے کوئی آڑے آیا بھی تو اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس لئے ان سے کوئی بھی شخص براہِ راست ٹکر لینے سے گریز ہی کرتا رہا۔ دوسری طرف انگریز اپنی پالیسیاں ایسے فطری انداز سے مرتب کرتے تھے کہ یہاں کے لوگوں کو ان سے بڑھ کر کوئی رفیق اور شفیق نظر نہیں آ رہا تھا اور ان پالیسیوں میں ظاہری طور پر کوئی منافقت بھی نظر نہیں آ رہی تھی ، ورنہ روایت یہی رہی ہے کہ ظالم حکومتوں کا تختہ وقت آنے پر مظلوم لوگوں نے ہی اُلٹا ہے لیکن فرنگیوں نے تاریخِ برصغیر میں اس وقت ایک نیا باب قائم کیا جب وہ یہاں سے بالکل بھی کسی مزاحمت کے بغیر جا رہے تھے بلکہ با ضابطہ اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کا وداع کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے یہاں کے لوگوں کو کچھ اس طرح سے اپنی صلاحیتوں سے مرعوب کیا کہ یہاں کے لوگ عقل کے کتنے بھی گھوڑے دوڑائیں ان سے مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگ ان کے ہر فیصلے پر لبیک کہنے کے پابند ہو گئے تھے۔ فرنگیوں نے جب ہندوستان میں اپنے ارمانوں کو پورا کیا تو چپ چاپ پتلی گلی سے بھاگ نکلے۔ "سونے کی چڑیا" کو 'رزم گاہ' میں تبدیل کر کے یہاں کی دو قوموں کو آپسی قتل و غارت اور رسہ کشی میں مبتلہ کر کے چلے گئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جب اردو زبان و ادب سے وابستہ ادباء اور شعرا نے قلم سنبھالے تو اُن کے سامنے بے گور و کفن لاشوں اور لُٹی پٹی عصمتوں کے ان گنت موضوعات ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اردو ادب میں تقسیم اور تقسیم سے پیدا شدہ حالات پر اوائل دور سے ہی لکھنا شروع ہوا اور خوب لکھا گیا۔ مرد اور خواتین تخلیق کاروں نے عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے اس موضوع کو اپنے اوراق کی زینت بنایا ہے۔ مردوں نے اپنے فن پاروں میں اس المیہ کو اپنے طرز سے نبھایا ہے وہیں دوسری طرف عورتوں نے اجتماعی صورتِ حال کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ طبقۂ نسواں کے حساس

اور نازک جذبات کی مصوری نہایت ہی دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ کی ہے۔انہوں نے ایک خاص ضابطے کے تحت اس میں جان ڈالی،حقائق کو کچھ اس طرح منظرِ عام پر لایا ہے کہ حق ادا ہوا ہے۔خواتین فکشن نگاروں میں اس المیہ کے تعلق سے بہت سارے نام قابلِ ذکر ہیں جن میں قرۃالعین حیدر، جیلانی بانو، رضیہ بھٹ اور خدیجہ مستور وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔انہوں نے اپنے دور کا بر پور تجزیہ اور مطالعہ کر کے ناول نگاری کی صنف کو بھی وسعت عطا کی ہے۔خواتین تخلیق کاروں میں تقسیم کے حوالے سے خدیجہ مستور کا نام ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا کیونکہ انہوں نے اپنے ناولوں میں اس دور کے دردو کرب،عوامی ناآسودگیوں اور معاشی ناہمواریوں کو اس طرح اپنے تخلیقی وجدان کا حصہ بنایا ہے کہ انسان ناول پڑھتے ہی اس سے آگاہ ہو جانے کے ساتھ ہی حظ لینا شروع کرتا ہے۔ان کی نفسیاتی اور جذباتی الجھنوں کی تصویر کشی بھی اکثر جگہوں پر قارئین کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔شائستہ فاخری اس حوالے سے لکھتی ہیں:۔

''خواتین ناول نگاروں میں گھر،خاندان،رشتے ناطے،وہاں کے مسائل اور مصائب ناول کے اہم موضوع بنتے رہے ہیں۔گھر ٹوٹتے ہیں تو تہذیب بگڑتی ہے،جب تہذیب بگڑتی ہے تو قدریں پامال ہوتی ہیں اور ان حالات میں نسلوں میں تلاطم آتا ہے،یہ تلاطم ان کی ذہنی کیفیت کو پستی کی طرف مائل کرتا ہے۔خواتین ناول نگاروں میں خدیجہ مستور کا نام بھی اپنی اہمیت کا حامل ہے،جن کے ناول کے موضوعات کچھ اسی قسم کے ہیں۔خدیجہ مستور کا آدم جی ایوارڈ یافتہ ناول" آنگن" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔اس ناول کا مرکزی موضوع ہند و پاک کی تقسیم ہے۔یہ ویسا ہی تھا جیسے ایک گھر کے دوٹکڑے ہو جانا۔تخلیق کار نے علامتی انداز میں تقسیم کے المیے کو" آنگن" میں اُتارا ہے......................ناول" زمین" میں ایسے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے،جو تقسیم کے بعد دوسرے ملک جا کر اپنی پرانی شناخت بھول جاتے ہیں،یا پھر حال کے حالات میں بھولنا ان کی مجبوری ہو جاتی ہے۔''[۱]

یوں تو چمکتے موتی بھی پتھر ہی ہوتے ہیں لیکن عام پتھروں اور موتیوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے اسی طرح نثر کے ذریعے سے اپنے قلبی احساسات کو منفرد اور دلنشین انداز میں پیش کرنا بھی ایک منفرد ادا

ہے۔لیکن عام فنکاروں اور خدیجہ مستور میں اس حوالے سے بہت فرق ہے۔ایک چھوٹے سے قصبے سے تعلق رکھنے والی اس فنکارہ نے زندگی کے اوائل دور میں ہی دور دور تک اپنے آپ کو منوایا تھا۔افسانہ نگاری سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کرنے والی اس فنکارہ نے آخر کار ناول نگاری میں اپنی شناخت قائم کی اور اسی کے سہارے اردو ادب میں اپنا نام امر کر دیا۔ناول نگاری نے ان کو اردو ادب میں وہ مقام عطا کیا جو آج تک بہت کم خواتین تخلیق کاروں کے حصے میں آیا۔

خدیجہ مستور نے پہلے اس دور کا مشاہدہ کیا،حالات وواقعات کو جانچا پرکھا تب جا کے اپنے قلم کو جنبش دے کر فن کاری کے میدان میں قدم رکھا۔اس نے اپنے دورِ تعلیم سے ہی حالات کے مد و جزر کو قریب سے دیکھا اور فکشن کے ذریعے سے ایسے نتائج اخذ کئے ہیں جن سے تقسیم کے دور کا پورا منظر نامہ اپنے حقائق کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔انہوں نے انگریزوں کی شاطرانہ پالیسیوں کا پردہ فاش کر کے ان سے بچنے کی راہ بھی دکھائی ہے۔دراصل،موصوفہ ہم پر یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ انگریزوں نے یہاں آنے کے وقت ہی سیاسی حالات کو بھانپ لیا تھا اور پھر اقتدار میں آ کے انہوں نے ان تمام خدشات وخطرات کو دور کیا جو ان کو راستے میں رکاوٹ لگ رہے تھے۔انگریزوں کی سیاسی برتری نے سرزمینِ ہند میں جو نئے گل بوٹے کھلانے شروع کر دیے تھے ان میں انگریزوں کی زیرکی کے ساتھ ساتھ یہاں کے مغل حکمرانوں کی بے عملی اور امیروں،وزیروں کی آپسی رسہ کشی اور پیشکش کو براہِ راست عمل دخل تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے ان پر یہ پورا واضح ہو گیا تھا کہ یہاں کی مشترکہ تہذیب وتمدن ہی ان کی حکومت کے لیے واحد خطرہ ہے اس لئے انہوں نے اسی دن سے اس کے خاتمے کے لئے اقدامات کرنا شروع کئے۔انہوں نے طرح طرح کی پالیسیاں مرتب کر کے یہاں کی مشترکہ تہذیب کا قلع قمع کیا،دھیرے دھیرے انہوں نے یہاں کے لوگوں میں وہ زہر گول دیا جس سے ان کی حکومت سازی صاف ہو گئی۔وہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ اگر برصغیر میں مختلف مذاہب کے لوگ کندھے سے کندھا ملا کر ہمارے خلاف سینہ سپر رہے تو ہم یہاں پر تادیر اپنی حکمرانی نہیں چلا سکیں گے،اس کے توڑ اور اپنی کامیابی کے در کھلے رکھنے کے لئے انہوں نے مختلف النّوع چالیں مرتب کیں اور ان سب چالوں اور پالیسیوں میں موثر ترین پالیسی ہندو مسلم اتحاد کا توڑ اور مشترکہ تہذیب کے تئیں یہاں کے لوگوں میں نفرت پھیلانا تھا۔اس

سازش کے رچانے کے لئے انہوں نے پہلے یہاں اپنا تعلیمی مواد تقسیم کیا،مشنری اسکولوں میں بچوں کو نصاب میں ایسے اسباق رکھے جن سے دونوں متحدہ قوموں کے درمیان ایک خلیج حایل ہوئی۔ یہ خلیج جو انگریز دن دہاڑے یہاں کے لوگوں کے درمیان ڈال رہے تھے یہاں کے لوگ سمجھنے سے آجز تھے۔ دونوں قومیں انگریزی تہذیب اور حکومت سے اتنے مرعوب ہو چکے تھے کہ دونوں اب ان کو ہی اپنا نجات دہندا سمجھ رہے تھے اور ان کے ہی رحم وکرم پے جی رہے تھے۔ کسی میں یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ان کی حقیقت کا پردہ فاش کرئے اور لوگوں کو ان کی عیاری اور مکاری سے باز رکھے۔ سارے لوگ اس کے بجائے آپسی منافرت کو ہی ہوا دینے میں مست و مدہوش تھے۔ ہندوؤں نے اپنے طور سے یہ عہد کیا تھا کہ اپنے خطے میں کسی بھی مسلمان کا نام ونشان تک نہ رکھیں گے اسی طریقے سے مسلمانوں نے بھی یہ عہد کیا تھا کہ اپنے خطے میں ہندوؤں کا صفایا کر کے چھوڑیں گے۔ تاریخِ برصغیر کے بدترین فسادت کا آغاز اسی ذیل میں ہوا جس میں لاکھوں انسانوں کی جانوں کا زیاں ہوا، بے تحاشہ املاک کو نذرِ آتش کیا گیا اور اسی سلسلے میں تاریخِ برصغیر کی سب سے بڑی ہجرت کا آغاز بھی ہوا۔ اس ہجرت میں لوگوں کو بے حد مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاریخ کی اس سب سے بڑی ہجرت کا المیہ یہ رہا کہ ہجرت کرنے والوں کو گردِ سفر کے علاوہ شاید کچھ ہاتھ نہ آیا۔ نئے ملکوں میں بہت کم لوگ خوشحال زندگی بسر کرسکیں کیونکہ اپنے اپنے ملکوں کے حصول کے لئے دونوں اطراف کے لوگوں کو اپنے عزیزوں کو کھونا پڑا اور املاک و اولاد کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ ہجرت کے دوران اگر چہ کچھ لوگ مادّی وسائل اکھٹا کرنے میں کامیاب رہے لیکن روحانی سکون ان کو بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ ان مادّای چیزوں کے پیچھے بے گناہوں، لاچاروں اور مجبوروں کا خون کارفرما تھا۔ ناصر کاظمی اس تناظر میں اپنے ایک شعر میں یوں کہتے ہیں:

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیانے جلائے گئے

اسی طرح بے خودموہانی نے بلوائیوں کے ہاتھوں اپنے گھر کی تباہی وبربادی کا نظارہ کرکے اُن

سے فریاد کی کہ: ؎

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے

کبھی روئے کبھی سجدے کیے خاکِ نشیمن پر

تقسیمِ برصغیر ایک ایسا المیہ ہے جس نے اس دور کے جملہ شعبہ جات پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ اس المیہ نے جہاں اس دور کی معاشرت، معیشت، سیاست، کاروبار اور فن کاری وغیرہ کو اپنی لپیٹ میں لیا وہیں اس المیہ نے اس دور کی عورتوں پر بھی سنگین اثرات مرتب کیے۔ دونوں اطراف سے عورتوں کو تاریخ کے بدترین حالات سے سابقہ پڑا اور ان کے خلاف وسیع پیمانے پر تشدد ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق تقسیم کے دوران ۷۵ ہزار سے لے کر ایک لاکھ عورتوں کو اغوا کیا گیا اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مردوں کی طرف سے عورتوں پر اس بہیمانہ ظلم کو مکمل دستاویزی شکل میں پیش کیا گیا ہے جس میں بہت ساری مظلوم عورتوں کے بیانات بھی درج ہیں۔ تجزیہ نگاروں کے اندازے کے مطابق ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں دوگنا مسلمان عورتوں کو اغوا کیا گیا اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اپنے کیے کی تلافی کے لئے تین سال بعد ۱۹۵۲ء میں دونوں ممالک کی حکومتوں نے اغوا شدہ عورتوں کی بازآبادکاری کے لئے ایک معاہدہ تشکیل دیا۔ اس معاہدے کے مطابق پاکستانیوں کے قبضے تلے ہندو اور سکھ عورتوں کو ہندوستان بھیجنا تھا اور ہندوستانیوں کے قبضے تلے مسلمان عورتوں کو پاکستان ارسال کرنا تھا۔

تقسیم کے دوران اغوا شدہ عورتوں کی صحیح تعداد ابھی تک راز ہی ہے اور اس حوالے سے تجزیہ نگاروں کے اندازے بھی مختلف سامنے آتے ہیں، لینارڈ موصلی دونوں اطراف سے اغوا شدہ خواتین کی تعداد ایک لاکھ تک بتاتے ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی حکومتوں نے اغوا شدہ عورتوں کا تخمینہ لگاتے ہوئے ان کی تعداد بالترتیب ۳۰ ہزار اور ۵۰ ہزار بتائی ہے۔ اینڈریو میجر اپنے اندازے کے مطابق تقسیم اور فسادات کے دوران اغوا شدہ مسلمان عورتوں کی تعداد ۴۰ سے ۴۵ ہزار تک بتاتے ہیں جو کہ ہندوؤں اور سکھوں سے دوگنی ہے۔ بیگم تصدق حسین اسی تعداد کو ۹۰ ہزار تک لے آتی ہیں۔ اس سرسری جائزے سے اگرچہ کوئی ٹھوس حقیقت سامنے نہیں آتی ہے تاہم یہ بات ضرور عیاں ہو جاتی ہے کہ تقسیمِ برصغیر میں عورتوں کو

جتنا ظلم کا نشانہ بنایا گیا اس طرح کے مظالم شاید تاریخِ برصغیر کے کسی بھی دور میں دیکھنے اور سننے میں نہیں آتے۔ یہ دور سچ میں برصغیر کی تاریخ کا سیاہ ترین دور ہے جس کی مثال لوگ تب سے آج تک دیتے آئے ہیں اور اس کی سنگینیت اور شدت کے پیشِ نظر آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔

دنیا کے مختلف علوم کا مطالعہ کرتے وقت ایک قاری پر یہ بات روزِ تاباں کی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ عورت ہمیشہ سے مظلوم اور مجبور رہی ہے اور ہر کسی معاشرے نے اس کے حقوق کو پامال کر کے اس کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا ہے اور سماج میں اس کو معمولی سی حیثیت بھی نہیں دی ہے۔اردو کے ادیبوں نے بھی اپنے فن پاروں میں عورتوں کے خلاف ان مظالم کا پرچار اوائل دور سے ہی بڑھ چڑھ کے پیش کیا ہے اور مختلف اصناف میں متفرق عنوانات کے تحت اپنے مُوقلم سے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیئے ہیں۔اردو ادب میں عورتوں کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔نثر و نظم میں اس حوالے سے فن کے اعلیٰ نمونے مل جاتے ہیں۔مرد اور عورت ذات دونوں نے یکساں طور پر اپنی شاعری اور نثری فن پاروں میں اس درد کو برتا ہے۔ناول، بلاشبہ تقسیم کے درد و کرب کو سمونے والی ایک موثر صنف ثابت ہوئی ہے۔ناول نگاری کے میدان میں اس حوالے سے فن کے اعلیٰ نقوش اپنے پورے کینوس کو پھیلائے ہوئے نظر آتے ہیں۔فن کاروں نے بلا امتیاز جنس ہر طرح کے کردار خلق کیے ہیں، ان میں اکثر مردوں اور عورتوں کے تحریر کردہ ناولوں میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن عورت تخلیق کاروں نے اپنے ناولوں میں جس حسن و خوبی کے ساتھ نسوانی کرداروں کو پیش کیا ہے اس درجہ پر مرد ادیبوں کا پہنچنا مشکل ہی نظر آتا ہے۔ عورتوں کی نفسیات، مردوں سے بڑھ کر عورتیں ہی بہتر طریقے سے سمجھتی اور محسوس کر سکتی ہیں، کیونکہ وہ خود بھی ان ہی احساسات کی متحمل ہوتی ہیں۔اس لیے انہیں اس شعبہ میں مردوں پر فوقیت حاصل ہے۔ پنڈت کشن کول اس حوالے سے اپنی کتاب ''نیا ادب'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''عورت ذات اپنے نفس کی گہرائیوں میں کیا اور کس طرح محسوس کرتی ہے۔کیا سمجھتی اور سوچتی ہے۔کیا کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں سکتی اور نہیں کہہ سکتی ہے۔یہ سب اب تک ہم پر سربستہ راز رہا ہے۔ہندستانی ادب اور بالخصوص اردو ادب میں ایسی مثالیں میری نظر سے نہیں گزریں''۔ [۲]

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خواتین ادیباؤں نے شاعری کے مقابلے میں فکشن کے میدان میں زیادہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور ناول نگاری کو خصوصی طور پر مختلف النوع فکری اور فنی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔فکشن کی تنقید میں یوں تو جانبداری کا سہارا نہیں لیا گیا مگر خواتین کے کارناموں کو برملا سراہا بھی نہیں گیا ہے اور ایسا کوئی تنقیدی مطالعہ سامنے نہیں آیا ہے جو خواتین تخلیق کاروں کو ایک مخصوص تفکیری رویے میں رواں دیکھے۔اس حوالے سے ڈاکٹر شافع قدوائی اپنے ایک مضمون ''معاصر ناول کے نسوانی کردار، ایک قرأت'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''ناول میں نسائی کرداروں کی پیشکش کو موضوعِ بحث بنانا فکشن تنقید کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے تاہم اردو میں مروجہ فکشن تنقید نے نسائی کرداروں میں .... زبوں حالی، کسمپرسی اور بے زبانی کا ذکر کیا ہے یا پھر مرد اساس معاشرے کے عورت سے متعلق ان تصورات کو موضوعِ بحث بنایا ہے جسے عورت کی ناگزیری امتیازی صفات گردانا جاتا ہے۔ مرد اساس معاشرے نے بعض انسانی خصوصیات مثلاً شفقت، ممتا، نرمی، بے لوث قربانی کا جذبہ، اطاعت شعاری اور پاک دامنی عورت سے مختص کر دیا اور جس عورت کے کردار سے یہ صفات مترشح ہوتی ہیں، وہ قابلِ تجسس اور دیوی مماثل ہے اور جو اس سے انحراف کرتی ہے وہ مردود اور مطعون ٹھہرتی ہے''۔ [۳]

اردو میں اوائل دور کے ناولوں میں صرف مرد اساس معاشرے کی نمائندگی ملتی ہے۔جس میں عورتوں کو وہی روایتی محبت و تسکین کی شے سمجھا جاتا تھا۔ جہاں پر ان کی نہ کوئی عزت تھی نہ حقوق کی پاسداری اور نہ ہی کوئی ان کے لیے آواز بلند کرنے دیتا۔مرد اساس معاشرے میں ان کی شخصیت مسخ ہو رہی تھی لیکن ان کی طرف کسی کی توجہ گامزن ہوتی تھی نہ ہی کوئی مرد ان کے حقوق کی بازآبادکاری کے لیے آگے آتا تھا جس کی وجہ سے وہ دبی کی دبی رہ گئیں۔ڈاکٹر شافع قدوائی اپنے مضمون ''معاصر ناول کے نسوانی کردار۔ایک تانیثی قرأت'' میں رقمطراز ہیں:۔

> ''امراؤ جان ادا سے اندھیرا پگ تک عورتوں کی اسٹریوٹائپ امیج ہی سامنے آئی ہے امراؤ جان ہو یا اوجائی چمپا ہو یا شمن، رانو ہو یا تنویر فاطمہ، زینو ہو یا

سلیمہ، شمی ہو یا روپ کنور ہر جگہ ایک ایسی عورت سامنے آتی ہے جو مرد اساس معاشرے میں اپنے انفرادی تشخص سے یکسر محروم اور قسم قسم کے ظلم اور زیادتیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ عورت کے وجود کا انحصار اس کی صنفی تخفیفی (gender specility) میں مضمر ہیں اور شاید ہی کسی ناول میں اسے ایک عام انسانی وجود (Normal human being) کا درجہ دیا گیا ہو۔ وہ ہر جگہ زنجیروں قید اور بے دست و پا ہے''۔ ے

لیکن بعد کی ناول نگارہ خواتین میں اکثر خواتین نے اس کے رد میں نسوانی کردار پیش کیے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں مرد کرداروں کے بجائے عورتوں کو فوقیت دے کر گویا ناول نگاری کی دنیا میں ایک انقلاب بپا کیا۔ ان ناول نگار خواتین میں عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر اور خدیجہ مستور کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ان ناول نگار خواتین میں عصمت چغتائی اور خدیجہ مستور نے خصوصی طور پر ایسے کردار خلق کیے ہیں جن میں روایات سے بغاوت کرنے کی صلاحیت سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اردو ادب میں یوں تو منجملہ طور پر اس حوالے سے وافر تعداد میں مواد ملتا ہے لیکن تمام اصناف میں سے اردو فکشن میں ہی زیادہ طور پر عورتوں کی پسماندگی اور کسمپرسی کی حالت کو خصوصی طور پر فنکاروں نے موضوع بنا کے برتا اور اہمیت کے اعتبار سے اُجاگر بھی کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کا صرف دعویٰ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اپنے فن پاروں کے ذریعے سے اس کی دلیل میں باضابطہ ثبوت بھی پیش کیے ہیں۔ داستانوی ادب کو چھوڑ کر ناول اور افسانہ میں اپنے آغاز سے ہی عورتوں کی مظلومیت کی داستان بیان ہوئی ہے۔ ہر کسی فنکار نے اپنے فن پاروں میں مرد کے بہیمانہ ظلم کو سامنے لاتے ہوئے عورتوں کے تئیں ہمدردی جتانے کی کوشش کی ہے کیونکہ برصغیر میں دورِ عتیق سے ہی عورتوں کی صورتحال بڑی تشویشناک بنی ہوئی تھی۔ یہاں پر ان کو عورت کم بلکہ ایک شے زیادہ سمجھا جاتا ہے جس کے لیے کوئی بھی نارواں سلوک بھی برتا جائے اس کو احتجاج نہیں کرنا ہے۔ ہر کوئی باشعور انسان اگر احتساباً اپنے آپ سے یہ سوال کرے گا کہ کیا عورتوں کی قسمت میں یہی ذلت اور رسوائی ہے؟ کیا ان کو سماج میں باعزت اور باوقار زندگی جینے کا کوئی حق نہیں؟ تو جواب یہی آئے گا کہ مرد کی ہی طرح عورت بھی عزت و آبرو کی حق دار ہے جس سے وہ صدیوں سے محروم ہی رکھی جا رہی ہے۔ حقیقی زندگی اگرچہ ایسے حالات و واقعات سے بھری پڑی ہے تاہم جدید اردو فکشن میں اس کی

تصویر ہمیں نا کے برابر دیکھنے کو ملتی ہے۔اکثر ادیب ابھی تک پرانے ہی رجحانات کے تحت اپنی تخلیقات منظرِ عام پر لانے میں مصروفِ عمل ہیں۔عورتوں کی پسماندہ صورتحال کے مقابلے میں ان کے جاندار اور فعال پہلوؤں کو سیاہ چاہ سے اظہر من الشّمس عیاں کرنے میں یوں تو کئی فکشن نگاروں کا نام لیا جا سکتا ہے تاہم ان تمام فکشن نگاروں میں اس حوالے سے خدیجہ مستور اولیت کی حامل ہے۔انہوں نے مجموعی طور پر اپنے افسانوں اور ناولوں میں عورتوں کی پسماندہ اور المناک صورتحال کو اُجاگر کیا ہے۔نہایت ہی خلوص،حقیقت پسندی اور غیر جانبداری سے پورے دور کو فن کارانہ رنگ میں پیش کر کے رنگین بنایا ہے جس سے اس دور کے تمام حالات و واقعات کا نقشہ ہمارے ذہنوں پر ثبت ہو جاتا ہے۔وہ مذہب یا سیاسی رجحان کے دباو یا لگاو کے تحت کسی جگہ جانبداری کی راہ پکڑ سکتی تھی لیکن اس نے ایک منجھے ہوئے فن کار کی طرح مذہبی اور نظریاتی لگاو سے پرے مسلم لیگ اور کانگریس کے وابستگان کا بڑی دیانت داری،حقیقت بیانی اور سچائی کے ساتھ نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ڈاکٹر اسلم آزاد تقسیم ہند کے حوالے سے ناول ''آنگن'' کی اہمیت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''تقسیمِ ہند کی ہولناکیوں اور فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں متعدد ناول لکھے گئے ہیں۔ہمارے ادیبوں نے نہایت حقیقت پسندی،دیانتداری اور خلوص سے ان فسادات کی انسانیت سوز خوں آشامیوں کا تجزیہ کیا اور جائزہ لیا ہے۔لیکن خدیجہ مستور نے اس ناول میں اس مسئلے کی وضاحت کی ہے جو اب تک عام طور پر لوگوں کی نظروں سے روپوش تھا۔'' [۵]

انہوں نے عورتوں کو فکشن کے ذریعے سے اپنے جائز مقام دلانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔اپنے دونوں ناولوں کے ذریعے سے اس نے عورت کی جو تصویر سامنے لائی ہے وہ روایتی تصویر سے قطعی مختلف ہے۔

خدیجہ مستور کے ناولوں کی سب سے بڑی خوبی اور انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں باقی فن کاروں کی طرح عورتوں کو روایتی مظلومیت کے لبادے میں ملبوس نہیں دکھایا ہے بلکہ دونوں ناولوں "آنگن" اور "زمین" میں تمام نسوانی کرداروں کو مردوں کی بیجا حکمرانی سے مبرٰی اور پاک،ان کے

خلاف سراپا جدوجہد دکھایا ہے۔ جو مردوں کے ظلم سے دبتی نہیں بلکہ اور بھی نکھر کے سامنے آتیں ہیں۔ کہنا تو یوں چاہیے کہ ان کے اکثر نسوانی کردار مردوں سے بھی زیادہ فعال اور پُرکشش نظر آتے ہیں۔ عورت ہونے کی حیثیت سے خدیجہ مستور نے اپنے نسوانی کرداروں کو جس احساس سے پیش کیا ہے وہ ان کا فنی کمال متصر کیا جانا چاہیے اور جس گہرائی اور گیرائی سے ان کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے وہ کسی مرد فن کار کے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے جملہ نسوانی کرداروں کا ایک ایسا نمونہ ہمارے سامنے چھوڑا ہے جن میں ایک تو مغربی تہذیب کی مشرقی تہذیب پر اجارہ داری دکھائی ہے اور دوسرا مشرقی عورتوں کے مختلف رجحانات کو سمویا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے سے عورتوں کی جو تصویر قارئین کے سامنے لائی ہے اس سے ہم اس دور کی عورتوں کی صورتحال سے بہ خوبی روشناس ہوتے ہیں۔ عبدالحق حسرت اپنے ایک مضمون "آنگن: ایک تنقیدی مطالعہ" میں اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''آنگن" کی دنیا مخصوص طور پر عورتوں کی دنیا ہے۔ جمیل ناکارہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر گھر میں گھسے رہتے ہیں۔ ان کے معمولی پن کے تاثرات ہمارے سامنے آتے ہیں اُن کا کردار واقعیت نگاری کی مثال ہو جاتا ہے،۔۔۔۔۔ عورتوں کے کردار بڑی حد تک گہرا تاثر چھوڑتے ہیں''۔[۶]

آدم جی انعام یافتہ ناول نگار خدیجہ مستور نے اگرچہ صرف دو ہی ناول تحریر کئے ہیں لیکن یہ دو ناول ہی ان کی مقبولیت کا باعث بنے۔ مصنفہ کے دو ناول "آنگن" اور "زمین" ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں ان دو ناولوں سے موصوفہ کے گہرے شعور، وسیع مطالعہ اور مشاہدے کا جستہ جستہ ادراک ہوتا ہے۔ دونوں ناولوں کا اسلوب سلیس اور عام فہم ہے جو کہ فنکار کی ایک بڑی خوبی تصور کی جاتی ہے۔ مکالمہ اور تکنیک کے اعتبار سے بھی دونوں ناول کامیاب ناول ہیں غرض دونوں ناول فنی اور موضوعاتی اعتبار سے اردو ادب کے چند بڑے ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔ موصوفہ کا پہلا ناول "آنگن'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں موصوفہ نے تقسیمِ ملک کے پسِ منظر سے بحث کرتے ہوئے مسلم لیگ اور کانگریس کے حامیوں کے نظریات پر گفتگو کی ہے اور تقسیمِ ملک پر ناول کا خاتمہ کیا ہے۔ اس ناول پر فنکارہ کو پاکستان کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ" آدم جی ایوارڈ" سے بھی نوازا گیا جو اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ موصوفہ کا

یہ ناول کتنا سراہا گیا ہے اور مقبول ہوا ہے۔موصوفہ کا دوسرا ناول "زمین" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔اس ناول کا آغاز تقسیمِ ملک کے پیش منظر یعنی قیامِ پاکستان سے ہوتا ہوا دورِ آمریت پر ختم ہوا ہے۔جس کی منظر کشی موصوفہ نے بڑے درد و کرب کے ساتھ کی ہے۔ناول "آنگن" میں مصنفہ کا زیادہ زور کانگریس اور مسلم لیگ کے نظریات کے تصادم پر رہا ہے، اُس تصادم کی پیشکش کے لیے موصوفہ نے کانگریس کی طرف سے بڑے چچا کو بحیثیت ترجمان پیش کیا ہے اور مسلم لیگ کی طرف سے چھمی اور جمیل کو لایا ہے۔اسی طریقے سے ناول "زمین" میں ساجدہ اور تاجی مہاجر لڑکیوں کی نمائندہ ہیں اور کاظم نئے پاکستان کا نمائندہ ہے۔متذکرہ ناول موصوفہ کے پہلے ناول کا ہی حصہ نظر آتا ہے جہاں سے انہوں نے اپنے پہلے ناول کا اختتام کیا ہے وہیں سے اپنے دوسرے ناول کا آغاز کیا ہے دونوں ناولوں کا مجموعی زماں دوسری جنگِ عظیم سے لے کر قیامِ پاکستان اور وہاں کی آمریت (Dictatorship) پر محیط ہے۔موصوفہ جو کہ خود لکھنو کی رہنے والی تھی کو بھی پاکستان ہجرت کرنی پڑی، تجربات و مشاہدات کی وجہ سے دونوں ناول اس دور کے پسِ منظر اور پیشِ منظر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہر ہر چیز پر نوحہ گری کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔دونوں ناولوں کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ متحدہ ہند کی تقسیم میں فرنگیوں کا ہاتھ رہا ہے یا نہیں یہ بات آج بھی موضوعِ بحث ہے، لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس دو قومی نظریے (Two Nation Theory) کے مطابق برصغیر کی تقسیمِ اول ہوئی تھی آگے چل کر پاکستان کی تقسیم سے اس کی تردید ہوگئی۔نئے ملک یعنی پاکستان کے وجود پذیر ہونے کے بعد ایک طبقہ ہجرت کر کے جس مقصد اور منشا کے تحت گیا تھا وہ مقصد پورا نہ ہوا اور وہاں کے حالات و واقعات نے بہت کم وقت میں یہ پیغام عام کیا کہ ہجرت اس کے سکون و اطمینان کا مداوا نہ بن سکی۔تقسیمِ ہند کے صرف ۲۴ سال بعد ہی ۱۹۷۱ء میں پاکستان بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان فرقہ واریت کے زیرِ اثر ہندوؤں کی ہٹ دھرمی اور مسلمانوں کی ناسمجھی کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔اس تقسیم کی وجہ سے خوں آشام واقعات کی انتہا نہ رہی، فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے لاکھوں جانوں کا زیاں ہوا، لاکھوں کی تعداد میں عصمتیں تار تار ہوئیں۔پاکستان کی تقسیم میں بھی خونریزی اور غارتگری کی فضا قائم رہی لیکن اس کی بنیاد تقسیمِ ہند کے بالمقابل مذہبی فرقہ پرستی کے علاقائی تعصب پرستی پر تھی۔فرنگیوں کے خلاف یوں تو دونوں قوموں نے مل کر محاذ آرائی کی تھی اور ان کے شکنجے سے نکلنے

کے خاطر تختہ دار پر چڑھنے سے بھی گریز نہ کیا لیکن المیہ یہ رہا کہ ابھی ملک آزاد بھی نہ ہوا تھا دوسری طرف تقسیم کا بدنما داغ برصغیر کے ماتھے پر لگ گیا تھا۔ اس طریقے سے تقسیم برصغیرِ اول جو دوقومی نظریہ پر مبنی تھا کا بطلان تقسیمِ پاکستان اور قیامِ بنگلہ دیش سے ہوا۔ موصوفہ نے ان حالات کی ایک ایسی تصویر ہمارے سامنے لا کھڑا کی ہے کہ اس تصویر کا عکس براہِ راست ایک قاری کے دماغ پر مرتب ہو جاتا ہے اور ان حالات کی پیشکش کے لیے ایسے ایسے کردار چن چن کر لائے ہیں جن سے اس دور کے حالات وواقعات پورے طور پر واضح ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم آزاد اس تناظر میں رقمطراز ہے:

''آنگن کی کردار نگاری نہایت متوازن، مکمل، موثر اور پرکشش ہے۔ اس کے کم وبیش تمام کردار زندگی کی سچائیوں سے وابسطہ ہیں۔ ان کے اندر حقیقت پسندی اور یہ ٹھوس حقائق پیش کرتے ہیں۔ آنگن کا کوئی کردار غیر ضروری، فضول اور بھرتی کا نہیں ہے۔ اور واقعات کی فطری نشونما میں اہم ادا کرتا ہے............... ..... بے حد قریب محسوس کرنے لگتا ہے''۔ ؎

موصوفہ نے ناول آنگن میں عالیہ، بڑی چاچی، چھمی، اور عالیہ کی اماں جی وغیرہ نسوانی کرداروں کے ذریعے سے تقسیم کے المیے کو پیش کیا ہے۔ موصوفہ نے جہاں اس المیے کی وضاحت اور صراحت کے لئے منجملہ طور پر مردوں اور عورتوں کے کرداروں کو برتا ہے لیکن بنیادی کہانی کو نسوانی کرداروں کے ذریعے سے ہی بیان کیا ہے۔ ناول میں سے بیشتر نسوانی کردار ہی فعال اور پرکشش ہیں۔ چودھری ابنِ نصیر اپنے مضمون "خدیجہ مستور: آنگن کے حوالے سے" میں اسی بات کو کچھ یوں سمیٹتے ہیں:

''آنگن میں مردانہ کرداروں کے مقابلے میں نسوانی کردار خاصے جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ایک دادی ہیں جو اپنی جوانی میں بڑے جاہ وجلال کی مستعد عورت تھی۔ ایک گھر کی ماما کریمن بوا ہیں جو خدمت گزاری، وفاداری اور نمک حلالی کو زندگی کا فریضہ جانتی تھیں اور نکبت اور زوال کے زمانے میں بھی اپنے آقا کے خاندان کا ساتھ چھوڑنا گناہ سمجھتی تھیں۔ ان دو بوڑھیوں کے علاوہ دو ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی سامنے آتی ہیں، ایک چچی دوسری اماں، چچی ہر حال میں قانع اور خدا کا شکر ادا کرنے والی عورت ہیں جو فراخ دلی اور تحمل کا نمونہ ہیں وہ ہر کسی کا قصور معاف کر سکتی ہیں اور

اپنے لیے ہر مصیبت قبول کر کے دوسروں کو سکھ پہنچانا جانتی ہیں۔'' [8]

عالیہ جو اس ناول کی ہیروئن ہے اس ناول کا مرکزی کردار بھی ہے۔ موصوفہ نے اُسی کے ذریعے سے ناول کے سارے واقعات واحد متکلم کے صیغہ میں بیان کیے ہیں۔ سارے حالات و واقعات اسی کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عالیہ کے ذریعے خدیجہ مستور نے وہیں کام لیا ہے جو بعض فنکاروں نے اپنے مشہور زمانہ استعاروں سے لیا ہے اور خدیجہ مستور کا یہ استعارہ اتنا مشہور ہوا ہے جتنا اس نے شاید کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یہ استعارہ ان تمام انسانوں کا پرتو ہے جو تقسیم کے مخالف تھے لیکن کسی نہ کسی طرح اس کی زد میں آ گئے۔ اس طرح کے تمام انسان جذبات سے زیادہ عقل سے کام لینے والے تھے، وہ دوررس اور دور بین تھے۔

عالیہ کا کردار مشترکہ تہذیب کا نمائندہ ہے، وہ جہاں مسلم لیگ کے حق میں نہیں ہوتی وہیں وہ کانگریس کے مخالف بھی نہیں ہوتی۔ اس کے دل میں دونوں تنظیموں کے لیے یکساں اہمیت ہوتی ہے البتہ انگریزوں کے خلاف اس کے دل میں کوٹ کوٹ کے نفرت بھری ہوئی تھی، یہ چیز اس کو اپنے والد کے توسط سے ملی ہوئی تھی کیونکہ اس کے والد نے بھی شدید غم و غصے کی حالت میں ایک انگریز آفیسر کا سر پھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے اس کو جیل جانا پڑا اور آخر کار جیل ہی میں اس کا انتقال بھی ہو جاتا ہے۔ اپنے والد کا انگریزوں کے تئیں اس منفی رجحان کا اثر کہیں نہ کہیں عالیہ پر بھی پڑا ہوا ہوتا ہے اور یہ اثر تب زیادہ ہی عیاں ہو جاتا ہے جب اس کی انگریزی زدہ پھوپھی نجمہ ان کے گھر آتی ہیں تو عالیہ کے ساتھ اس کا رویہ رشتہ دارانہ کم اور انگریز نما زیادہ ہوتا ہے جس کے ردِعمل میں عالیہ کی انگریزوں کے خلاف نفرت صاف جھلکتی ہے:

> ''مظہر بھیا نے بھی جیل جا کر جانے کون سا تیر مار لیا، بس حد ہے بھئی، کوئی خط وط بھی آیا ان کا کہ نہیں؟ یا شرمندگی کے مارے چپ ہیں؟ مجھے تو ایک خط بھی نہ لکھا۔ نجمہ پھوپھی اماں سے مخاطب تھیں مگر امّاں اس طرح پان بناتی رہیں جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ عالیہ کا جی کڑھ گیا، یعنی کہ ابّا کی بہن بھی انہیں مجرم سمجھتی ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ نجمہ پھوپھی کی زبان کاٹ لے۔ اچھا ہی ہوا جو امّاں نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔'' [9]

عالیہ اس ناول میں اگرچہ بہت سے حالات سے نبرد آزما ہوتی ہے مگر وہ زمانے کے سرد و گرم کا ڈٹ

کر مقابلہ کرتی ہے اس کے اندر بھی اگر چہ محبت کا جذبہ ہوتا ہے مگر وہ اس جذبے کے ہاتھوں مردوں کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتی۔ وہ حالات و واقعات کا تجربہ کر کے اور موقع و محل کے حساب سے مردوں کے بناوٹی پیار و محبت کے پھندوں سے اپنے آپ کو آزاد کرتی ہے وہ کسی مرد کی محبت کا اعتبار اس لیے نہیں کرتی کیونکہ اس نے محبت کی وادی میں پہلے سے ہی بہت چوٹیں دیکھی تھیں اس نے اپنی بہن تہمینہ اور ہندو لڑکی کسم دیدی کا حشر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کے عین مطابق گو کہ اس کو بھی جمیل ،صفدر اور پاکستان کے ڈاکٹر سے وقتی طور پر لگاؤ سا ہو جاتا ہے مگر وہ لگاؤ کبھی دائمی محبت میں نہیں بدل پاتا کیونکہ وہ اس نقطے پر یقین رکھتی ہے کہ مرد عورت کو محبت کے جھانسے میں پھنسا کر اس کو محکوم بناتا ہے اور اس سے اس کی آزادی چھین لیتا ہے جو اس کی نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہوتی ہے۔ عالیہ کا کردار دراصل ان لوگوں کا نمائندہ کردار ہے جو دل ہی دل میں تقسیم کے مخالف تھے مگر عملی طور پر وہ حکمرانوں کے فیصلوں کے آگے کسی نہ کسی خطے کے ساتھ منسلک ہونے پر مجبور ہو گئے اور اس طرح یہ معصوم لوگ حکمرانوں کے ہتھے چڑھ گئے اور مجبوراً مہاجر یا شرنارتھی بننے پر مجبور ہوئے۔ جب کہ ان کی جدوجہد سے بالکل بھی اس بات کا عندیہ نہیں ملتا۔ ان کے ہاں تو ہجرت کا تصور نا قابلِ یقین تھا اور ایسا سوچنا بھی نامعقول لگ رہا تھا۔ جمیل کی ذیل کی عبارت اس بات کو مدلل بناتی ہے:

> ''تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے؟ بڑی چچی نے پوچھا۔ واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی، جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔ مگر ہندو ہمیں رہنے کیوں دیں گے، وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاو۔ ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے، ہم ان سے کب کہیں گے کہ جاؤ۔ جمیل بھیا کی دلیل بڑی چچی کی سمجھ میں آ گئی تو انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔'' [۱۰]

اس عبارت سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ برصغیر کے لوگوں کے ہاں تقسیمِ ملک کا جو تصور تھا وہ سیاسی آقاؤں سے قطعی جدا تھا۔ ان کے ہاں تقسیم کا تصور مذہبی آزادی پر محیط تھا جس کا ہجرت اور خون خرابے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اپنی حقیقت سے اچھی طرح آشنا تھے کہ ہم مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہیں اور اسی میں ہماری بھلائی ہے لیکن حاکموں نے اپنی خود غرضی کے تلے ان کی آرزؤں اور

امنگوں کا جس برے طریقے سے خون کیا اس کی مثال آج ہم ہر نگر اور ڈگر میں میں دیکھ رہے ہیں، دونوں خطوں کے لوگ آج بھی اسی گندی سیاست کے تلے روندے جا رہے ہیں۔ لوگ آج بھی حکمرانوں کے بوئے ہوئے ۷۰ سالہ پہلے زہریلے بھیج کا فصل بغض و عناد کی صورت میں کاٹ رہے ہیں۔ لوگ اس کا خمیازہ آج بھی بھگت رہے ہیں جس کی پہل حکمران طبقے نے کی تھی اور اب تک اسی مزے میں ہیں۔ وہ آج تک شہیدوں کے خون سے سودا کیے ہوئے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

عالیہ خود جنگ و جدل کے خلاف ہے کیونکہ جنگوں میں جانوں کے زیاں اور تباہی کے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آتا، جنگوں سے انسانیت ہمیشہ کے لیے ایک ایسے عذابِ مسلسل میں مبتلا ہو جاتی ہے جس کا ازالہ آئندہ نسلوں کے لوگ پھر صدیوں تک پورا نہیں کر پاتے، لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ جنگ کے معاملے میں موت ایک قطعی حقیقت ہے، بقولِ شخصے "موت کسی نہ کسی بہانے سے آ جاتی ہے" جنگ اس کا ایک موثر بہانہ ہوتا ہے۔ جنگ اور موت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی جنگ ہوئی ہو جس میں ہزاروں کی تعداد میں جانوں کا زیاں نہ ہوا ہو اور اِکے دُکے جنگ ہی ایسے نظر آتے ہیں جن میں تعداد گھٹ کر نیچے آئی ہو۔ میدانِ جنگ کا عجیب ہی نقشہ ہوتا ہے کہیں سر کٹے پڑے ہیں تو کہیں دھڑ، کہیں کوئی زخمی سپاہی تڑپ رہا ہوتا ہے تو کہیں کوئی لاچار حالت میں پانی کی ایک بوند کو ترستا رہتا ہے۔ برصغیر کی جنگ میں بھی ہمیں یہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے یہاں کے لوگ جنگی جنون میں جیسے دیوانے ہو رہے تھے۔ ان کے ہاں نظریات نے مذہب کی جگہ لی تھی اور اسی بنیاد پر وہ بے تحاشہ ایک دوسرے کے سر کاٹ رہے تھے، کچھ دنوں میں ہی خون بہانے کی تاریخ رقم ہوئی۔ لوگوں نے دن دہاڑے ارض وسماں کو ایک نیا پیغام دیا کہ دوستی، محبت و انسیت کسی نام پر بھی ہوئی ہو لیکن مذہبی جنون میں آ کے انسان ان سب چیزوں کو کبھی بھی دشمنی، بغض، نفرت اور کینہ پروری میں تبدیل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اسی بدلے ہوئے جذبے کے بغیر یہاں کے لوگ کیسے مشترکہ تہذیب کے ان چمکتے چراغوں کو گل کر دیتے جو ایک زمانے میں بے مثال روشنی سے منور کرتے تھے۔ اس المیہ کو سعادت حسن منٹو نے نہایت ہی پُر درد انداز میں یوں بیان کیا ہے:

''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔ یہ کہو کہ دو لاکھ

> انسان مرے ہیں اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنیوالے کسی کھاتے میں نہیں گئے۔ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مرگیا ہے لیکن وہ زندہ ہے زندہ رہے گا۔اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کرکے ہندؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہوگیا مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کئے جا سکتے ہیں۔مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں روح میں ہوتا ہے۔چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہوسکتا ہے[11]

خدیجہ مستور نے بھی ناول کے مرکزی کردار کے ذریعے سے اسی بات کی وضاحت کرنا چاہی ہے۔ عالیہ ایک سنجیدہ اور بالیدہ نظر لڑکی ہے خودداری سے سرشار اور اپنی روایات کی پاسدار ہے۔وہ اپنے معاشرے کی ہر اچھائی اور برائی سے واقف ہے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے سماج کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دور نہیں کر پاتی۔البتہ اس کے دل میں جو باتیں ہیں ان کا صحیح ہونا اسی طرح ثابت ہے جس طرح آفتاب سے نکلی ہوئی چمکتی روشنی۔وہ جو باتیں دل میں چھپائے بیٹھی ہے ان ہی باتوں میں اس کا نظریہ جنگ بھی اہم ہے۔وہ جہاں جنگوں میں شریک انسانوں کے تئیں اپنی ہمدردی اور فراخدلی کا مظاہرہ کرتی ہے اور ان کی عظمت کی قائل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ان کو شک آور نگاہوں سے بھی دیکھتی ہے کہ جنگوں میں شریک انسان کسی دوسرے انسان کے خیر خواہ نہیں ہوتے، ان کا کوئی رفیق ہوتا ہے نہ ہی کوئی شفیق وہ صرف مرنے اور مارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کے پاس زندہ رہنے کا کوئی لائحہ عمل نہیں ہوتا، وہ اگرچہ اپنی زندگی داؤں پر لگا کے قوم وملک کے تئیں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس سے وہ ایک تو اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہیں اور اس سے بڑھ کر پیچھے چھوڑے گھر والے بھی اس سب سے انتہا درجے تک متاثر ہوتے ہیں۔موصوفہ نے دراصل یہاں پر عالیہ کے ذریعے سے اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔جنگوں کے تعلق سے اپنے نظریے کو عالیہ کی زبانی بیان کرتے ہوئے جنگ وجدل کی تباہ کاریوں پر نقطۂ نظر کا پرچار کرتے ہوئے یوں لکھتی ہے:

> ''اس کا دل ان کتابوں کے ہر اس کردار سے ہمدردی رکھتا تھا جنہوں نے آزادی

اور انسان کی فلاح و بہبود کے لئے گولیاں کھائیں، مگر وہ ان سے خوف بھی محسوس کرتی
تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسے لوگ کسی سے محبت نہیں کرتے، یہ لوگ شادیاں کرتے
ہیں، بچے ہوتے ہیں اور انہیں تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کا گھر دنیا کے کسی حصّے میں شامل
نہیں ہوتا۔ ان کے گھر والے انسان نہیں ہوتے، یہ محبت کے قدموں کے کانٹے
ہوتے ہیں جو ذرا دیر میں لہولہان کر دیتے ہیں''۔ [۱۲]

غرض جنگ میں خون خرابے اور تباہی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ برصغیر کے لوگوں نے بھی کچھ اسی طرح جنگ لڑی وہ بے تحاشہ لاشے بچھا رہے تھے اور مال و املاک کو آتشی شعلوں کی نذر کر رہے تھے البتہ اس جنگ کی خاص بات یہ رہی کہ یہ جنگ برسوں سے ساتھ رہتے آئے لوگوں نے آپس میں لڑی۔ نظریہ کے نام پر ان لوگوں نے ہر کسی مشترکہ چیز کو نظر انداز کیا۔ ایک طرف سے کانگریسی، مسلم لیگ کے کارندوں کا صفایا کرنے پر تلے ہوئے تھے اور دوسری طرف مسلم لیگ کے حامی کانگریس سے جڑے افراد کا تہہ و بالا کرنے میں مصروفِ عمل تھے۔ بعض مسلمان بھی کانگریس کے ساتھ جڑے تھے اور وہ مسلمان کانگریسی اپنے گھر والوں کے ساتھ ہمیشہ نظریاتی ٹکراو میں رہتے تھے اور آخر کار اسی نظریاتی اختلاف کی وجہ سے تاریخِ برصغیر کا یہ عظیم حادثہ پیش آیا۔

چھمی بغیر ماں باپ کے لڑکی ہے جو مسلم لیگ سے وابستہ ہوتی ہے اور لیگ کے جلسوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتی ہے۔ چھمی اس ناول کا سب زیادہ متحرک اور فعال کردار ہے وہ عالیہ کی ممیری بہن ہے۔ وہ ضدی، منہ پھٹ، پھوہڑ کردار ہے اس میں باغیانہ پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ شریر اتنی کہ گھر میں ہر کوئی اس سے چڑاتا ہے وہ بڑے چچا کو تنگ کرنے کے لئے ہمیشہ گھر میں مسلم لیگ کے جلسے منعقد کراتی ہے، بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بڑے چاچا جب بھی گھر میں گھستے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اکٹھا کر کے مسلم لیگ کے حق میں اور کانگریس کا خلاف نعرہ بازی شروع کرتی ہے۔ ''چھمی'' اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پہ نہیں چھوڑتی نہ ہی خود کو ماحول کی غلاظت میں بہنے دیتی ہے بلکہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ وہ جمیل سے بے انتہا محبت کرتی ہے اور اس کے لیے ہر کوئی قربانی دینے کی بھرپور کوشش کرتی ہے لیکن عالیہ کے اس گھر میں آنے سے جب جمیل چھمی کو چھوڑ کر اسی میں دلچسپی لینے لگتا ہے تو

چھمی ،شمن کی طرح احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوجاتی ہے اور نہ ہی غم و غصے میں کوئی اور سخت قدم اٹھاتی ہے بلکہ ان حالات کو برداشت کر کے ایک الگ ہی روش اختیار کر کے جمیل سے کہتی ہے:۔

''بھئی جو ہم سے محبت کرئے گا ہم اس سے محبت کریں گے یہ تو بدلہ ہے
اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے''۔ [۱۳]

عالیہ کے ساتھ بڑھتی دلچسپی کے پیشِ نظر چھمی ،جمیل سے نفسیاتی انتقام لیتی ہے جس کے لیے وہ منظور کا انتخاب کرتی ہے۔جمیل اور منظور دونوں کے جنگ پر جانے کے بعد جب اسکی شادی ہو جاتی ہے تو کچھ وقت تک لگتا ہے کہ چھمی جذباتی شکست کھا کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت کھوگئی ہے لیکن جب ملک آزاد ہو جاتا ہے اور اس کا شوہر اور سسرال والے پاکستان جانے لگتے ہیں تو وہی چھمی جو تب تک پاکستان کے لیے جان چھڑکتی تھی اور طفلانہ سطح پر جلسے منعقد کرواتی تھی،جمیل کے قریب رہنے کی خاطر سسرال والوں سے جھگڑ کر طلاق لے لیتی ہے۔

ناول 'آنگن' میں چھمی کا کردار اگرچہ نمائندہ کردار کی حیثیت نہیں رکھتا مگر ایک ایسا کردار ضرور ہے جس کے بغیر پورا ناول کامیاب قرار نہیں دیا جا سکتا ہے،وہ دلچسپ اور پہلودار کردار ہے۔اس کی انفرادیت کی ترویج میں اس کے اور منفرد ماحول کا بھی بھرپور ہاتھ ہے۔والدین کے لاڈ پیار سے محروم و ناامید،تعلیم سے محروم،محبت وشفقت کی متلاشی لڑکی ہے۔نیلم فرزانہ اس تناظر میں رقمطراز ہیں:

''چھمی کی شخصیت،'ٹیڑھی لکیر' کی 'شمن' کی یاد دلاتی ہے۔شمن کا یہی ماحول نفسیاتی طور پر اس کی شخصیت میں ٹیڑھا پن کرا دیتا ہے لیکن چھمی اپنی ذہانت اور بیبا کی کے سبب کسی بڑی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہوتی۔وہ تمام الجھنوں اور پریشانیوں کے باوجود جینے کی کوئی ہموار راہ نکال ہی لیتی ہے''۔ [۱۴]

ناول ''آنگن'' کی چھمی اور ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن میں جہاں بہت ساری باتیں یکساں ہیں وہاں یہ بات بھی ان میں مشترکہ ہے کہ دونوں کردار روایتی معاشرتی حصار کو توڑ کر اپنی مرضی کے مطابق زندگی گذارتی ہیں۔وہ کسم اور تہمینہ کی طرح سماج کے بندھنوں کی کوئی برواہ کئے بغیر اپنے من کے فیصلوں کو ہی راہ نما بناتی ہیں۔شبنم آرا اس تناظر میں لکھتی ہیں:

''تانیثی نقطۂ نظر سے شمن ہمارے سامنے ایک جدید عورت کی علامت بن کراُبھرتی ہے کیونکہ اسکے اندر روایت سے بغاوت اوراپنی پسند کے مطابق زندگی جینے کا حوصلہ وجذبہ پنہاں ہے۔وہ اپنی زندگی کی راہ خود طے کرتی ہے جسے اپنے لئے مثبت تصور کرتی ہے۔اس کی زندگی پرسماج اوراس کے بوسیدہ روایات کا کوئی بس نہیں چلتا ہے''۔ [۱۵]

اسی طریقے سے 'چھمی' بھی کسی سے ڈرتی نہیں ۔اس میں بھی باقی کرداروں کے برخلاف روایات سے انحراف کرنے کا مادّہ موجود ہے ۔اس میں زندگی اور جانداری ہے،نا مساعد حالات اور نا سازگار صورتِ حال اس کے کردار کو ناہموار کر دیتی ہے، چڑ چڑا پن اور بدمزاجی اس کی صفت بن جاتی ہے۔ چچا کے گھر میں رہ کے بھی اس کے نظریے کے خلاف مہم جوئی کرتی ہے۔جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے چچا کے ہاں کانگریسی ساتھی بیٹھے ہیں تو باقی بچوں کے ساتھ مل کر نعرہ بازی شروع کر دیتی ہے:

''مسلم لیگ زندہ باد۔بن کے رہے گا پاکستان۔دھنیا راج نہیں چلے گا۔چٹیا راج نہیں ہوگا''۔[۱۶]

چھمی کے اس چڑ چڑے پن اور بدمزاجی کا سب سے بڑا موجب والدین کے محبت کی محرومی ہے کیونکہ 'شمن' کی طرح ہی 'چھمی' ماحول اور معاشرے کی خرابی کی وجہ سے نفسیاتی اُلجھن میں پھنس جاتی ہے۔لیکن جو بات 'چھمی' اور 'شمن' کے کرداروں میں تفریق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ 'چھمی'، 'شمن' کی طرح کسی بڑی نفسیاتی آلودگی میں نہیں پھنس جاتی۔وہ جس سے بھی رشتہ قائم کرتی ہے اس کے رشتے کی انتہا محبت کی تلاش ہی ہوتی ہے۔اگر چہ 'شمن' کے کردار میں بھی اس چیز کی آمیزش پائی جاتی ہے مگر وہ اپنے آپ کو سماج کی گندگیوں سے خود کو روک نہیں پاتی۔اسکول، ہوسٹل اور کالج وغیرہ میں اسے ایسا ماحول مل جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہم جنس پرستی اور سماج کے بچھائے باقی جالوں میں بھی آسانی سے پھنس جاتی ہے۔ 'شمن' اور 'چھمی' دونوں زندگی میں وفا کی تلاش میں نکلی تھیں لیکن دونوں کو اس میدان میں مات کھانا پڑتی ہے۔

چھمی کا کردار بے باک اور دل پھینک لڑکیوں کا نمائندہ ہے وہ تہمینہ اور کسم دیدی کی طرح حالات کے بہاو میں نہیں بہہ جاتی بلکہ ان کا رخ موڑ کر اپنے لئے سازگار بناتی ہے۔اگر چہ اس پر بھی تہمینہ اور کسم دیدی کی طرح مصیبت آن پڑتے ہیں لیکن وہ خودکشی نہیں کرتی بلکہ ہنسی خوشی ہر فیصلے کا استقبال کرتی

ہے۔اس میں زندگی کی حرکت اور حرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہے وہ ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہو کے ان کو ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔

عالیہ اور چھمی کے علاوہ نجمہ پھوپھی کا کردار بھی تقسیم برصغیر کے المیے کے حوالے سے بے حد اہمیت کا حامل ہے اس نے انگریزی میں ایم۔اے کر کے گویا دنیا کا سب سے بڑا کام سر انجام دیا ہے۔وہ اپنے بغیر ہر کسی کو جاہلوں اور گنواروں میں شمار کرتی ہے اور تو اور انگریزوں سے محبت کے نتیجے میں ہر کسی مشرقی خاندان کو ہدفِ تنقید بناتی ہے اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔وہ کسی کو بھی اپنے برابر نہیں سمجھتی، ہمیشہ گھمنڈ اور غرور کے نشے میں چور دوسروں کو حقیر اور کمتر سمجھتی ہے۔خدیجہ مستور نے دراصل نجمہ پھوپھی کے کردار کے ذریعے سے فرنگیوں کے ہاں برصغیر کے لوگوں کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔اس کا کردار ایک پورے طبقے کا نمائندہ بن کر سامنے آیا ہے۔یہاں کے لوگوں کو کمتر اور نیچا دکھانے سے ان کا مقصد لوگوں میں احساسِ کمتری کا جذبہ پیدا کرنا تھا جس کی بنا پر وہ کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جائیں۔لارڈ میکالے نے بھی اسی جذبے کے تحت یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ "مشرق کا پورا ادبی سرمایہ مغربی ادب کے ایک شلف کے برابر بھی نہیں" جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنا بیشتر سائنسی و علمی مواد عربی اور فارسی سے ترجموں کے ذریعے سے لیا ہے لیکن دوسروں پر رعب جمانے کی غرض سے یہ مکار قوم دوسروں کے سامنے کبھی بھی اپنی حقیقت عیاں نہیں کرتے۔برصغیر ہندو پاک کے لوگوں میں فرنگیوں کی نظروں میں کوئی تفریق نہیں تھی ان کے سامنے مذہب سے زیادہ اس خطے کی اہمیت تھی جس کے حصول کے لیے انہوں نے انسانی جانوں کو تجارتی شے کے بطور استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔وہ منجملہ طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں پر یکساں طعنے کستے تھے اور ان کی تذلیل اور تحقیر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔نجمہ پھوپھی کے ان جملوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔:

> ''تم جمیل میاں کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے جمیل بھیا سے پوچھا۔بس، بی۔اے کر کے بیٹھ رہا ہوں'' جمیل بھیا نے جواب دیا''۔واہ! صرف بی اے سے کیا ہوتا ہے، آدمی جاہل ہی رہ جاتا ہے، تھوڑی تعلیم خطرناک ہوتی ہے۔کرنا ہے تو ایم۔اے، بی۔ٹی کرو، اب مجھے دیکھو جس کالج میں جاؤں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہوں مگر ایم اے بھی کرو تو انگلش میں، اردو ایم۔اے تو ہر جاہل بھی کر سکتا ہے۔۔۔۔۔۔اس خاندان کی یہی

تو بدنصیبی ہے کہ کوئی لڑکی پڑھی لکھی نہ نکلی"۔۔۔۔۔ نجمہ پھوپھی نے عالیہ کو بھی جاہلوں
میں شمار کرلیا''۔ [۱۷]

انگریزی ایم۔اے اور اردو ایم۔اے، کے ذریعے سے یہاں پر دراصل مصنفہ نے دو تہذیبوں میں فرق واضح کیا ہے۔ نجمہ پھوپھی کا ایم۔اے اردو کے حامل جمیل کو جاہل قرار دینا، مشرقی تہذیب کے حامل انسانوں کو کمتر اور پست قرار دینا ہے اور ایم۔اے انگریزی کی برتری انگریزی تہذیب کی برتری کو ظاہر کرتا ہے جو کہ انگریزوں کا عام موقف تھا۔ وہ مشرق کے لوگوں اور مشرقی علوم کو فضول شے قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مشرقی تہذیب کی قدر و قیمت گھٹر کے ملبے کی سی بھی نہیں تھی اگر کچھ تھی بھی اس کا برملا اظہار انہوں نے کبھی کیا ہی نہیں۔ وہ ایک مذموم سازش کے تحت یہاں کی تہذیب وتمدن کا جنازہ نکال رہے تھے اور اس کی جگہ اپنی تہذیب وتمدن کے جڑ زمین میں پیوست کر رہے تھے۔ المیہ کی بات یہ ہے کہ اس سفاکانہ کارِبد میں ان فرنگیوں کو بہت سارے مقامی لوگوں کی معاونت بھی حاصل تھی جن کی وجہ سے ان کے عزائم ہر چڑھتے ہوئے سورج کے ساتھ اور بھی بلند و بالا ہوتے جا رہے تھے اور ان کے پایۂ استقلال میں ایک چھوٹی سی جنبش بھی نہیں آتی تھی۔

عالیہ کی اماں کا کردار بے درد اور مطلب پرست کردار کے طور پر سامنے آتا ہے، وہ احسان فراموش اور گھمنڈی کردار بھی ہے۔ اس کا کردار نظریاتی اعتبار سے نجمہ پوپھی کے ساتھ غائیت درجے تک ملتا جلتا ہے جس طرح نجمہ انگریزی میں ایم۔اے کر کے اس پر اتراتی رہتی ہے اسی طرح عالیہ کی اماں بھی انگریزوں کی بھاوج ہونے کی وجہ سے گھمنڈ اور احساسِ برتری کا شکار ہوتی ہے۔ انگریزوں کی بھابی ہونے کی وجہ سے (بھائی کی بیوی انگریز تھی) وہ انگریزوں سے بے حد محبت کرتی ہے اور ان پر ہمیشہ جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ فرنگی اسے ہر دکھ کا مداوا اور ہر غم کی آس نظر آتے ہیں وہ ان کو باعثِ رحمت سمجھتی اور باعثِ تقلید بھی۔ وہ انگریزوں کی محبت میں اتنی شدید ہوتی ہے کہ فرنگی کے قتل کے الزام میں بند اپنے ہی شوہر کو موردِ الزام ٹھہراتی ہے اور مقابلے میں انگریزوں کے حق میں قصیدے پڑھتی ہے۔ وہ انگریزی تہذیب اور انگریزوں سے بہت زیادہ متاثر ہے وہ بات بات پر مشرقی تہذیب کو مغربی تہذیب کے مقابلے میں دوسرے درجے کی فوقیت دیتی ہے۔ مسز ہاورڑ سے بات کرتے ہوئے وہ جوش میں آ آ کر

اپنے اس نظریہ کا اعتراف کرتی ہے۔ مسز ہاورڑ جب ہندوستان کی برائی کرنے میں زمین آسمان ایک کرتی ہے تو اُس کے جواب میں عالیہ کی اماں اس کی باتوں کی تصدیق کچھ یوں کرتی ہے:

''ہاں! اس ملک کے لوگ بڑے گندے ہوتے ہیں۔ ہماری بھابی، یعنی ہمارے بھائی کی بیوی انگریز ہے'' اماں نے بڑے فخر سے کہا............ ''یہاں کی عورتیں مرغیاں پالتی ہیں، اوران کی گندگی''...... اماں جانے اور کیا کہتیں کہ آپا بیچ میں بول اُٹھیں۔''[۱۸]

عالیہ کی اماں کا کردار تقسیم کے دور کے ان لوگوں کا نمائندہ کردار ہے جو اگر چہ مشرقی النسل تھے مگر فرنگیوں کے ساتھ کسی نہ کسی رشتے کے ساتھ منسلک ہونے کے نتیجے میں انہیں کے مقلد اور پرستار بن کر رہ گئے تھے۔ یہ لوگ منافق طبعیت اور موقع پرست لوگوں کے روپ میں سامنے آئے۔ انگریزوں سے معمولی فائدہ اٹھانے کے لئے ان ہی کی چھاوں میں پناہ لینا چاہتے تھے لیکن انگریز جیسے عیار و مکار بھلا ان جیسے منافق طبعیت کے حامل لوگوں کو کیسے گھاس ڈالتے جبکہ وہ ان کی بے اعتناعی اور بے وفائی کا پہلے سے ہی ادراک رکھتے تھے کیونکہ انگریزوں کو اس بات پر کامل یقین تھا کہ جو لوگ مفاد کے خاطر آج اپنوں کو دوکھا دے سکتے ہیں وہ کل غیر کے ساتھ کون سا خیر کا معاملہ کریں گے۔ اس لیے انگریز ان جیسے لوگوں کو اپنے قریب بھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے۔ یہ لوگ اتنی شدت اختیار کر گئے کہ اپنوں ہی کے خلاف ہو گئے اور پرایوں کے تلویں چاٹنے پر مصر تھے حالانکہ ان فرنگیوں کو ان سے محبت تھی اور نہ کوئی ہمدردی، وہ تو بس ان جیسے لوگوں کا استعمال صرف اپنی ناکامیوں کے وقت کرتے تھے تا کہ برصغیر کے لوگوں پر تا دیر اپنے حکم چلاتے رہیں فرنگی نظامِ حکومت کو برصغیر میں فروغ پانے میں جہاں انگریزوں کی عیاریاں اور مکاریاں کام کر رہی تھیں وہیں مقامی مغل حکمرانوں اور ان کے صوبعداروں نیز گورنروں کی بے عملی نے بھی اس نوآبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے میں مدد کی۔ ماہرین مابعد نوآبادیات نے مقامی سہولت کاروں اور معاونین کی درج ذیل درجہ بندی کی ہے جنہوں نے حقیر مفادات کی تکمیل اور تحصیل کی خاطر اغیار کے اوچھے ہتھکنڈے بننا گوارا کیا:

۱۔ وہ لوگ اپنے حقیر مادّی مفادات کی تکمیل فرنگی نظام کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔

۲۔ وہ لوگ جو شعوری طور پر نہ فرنگی نظام کے ساتھ تھے اور نہ خالص ہندی، بلکہ وہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ بہہ جانے میں اپنی عافیت تصور کرتے ہیں۔

۳۔ وہ لوگ جو پسِ پردہ نو آبادیاتی نظام کو تقویت پہنچاتے ہیں بلکہ ظاہری طور پر وہ اُس کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں۔

تہمینہ اور کسم کا کردار نسوانی کرداروں میں مختلف زاویوں سے یکساں ہیں، دونوں کے مذاہب اگرچہ مختلف ہیں لیکن ان کی زندگیوں کی نشونما میں بہت حد تک مماثلت ہے۔ دونوں کردار مظلومیت کے شکار ہو جاتے ہیں اور خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تہمینہ، عالیہ کی بڑی بہن ہے جو کہ ہمیشہ روایتی مشرقی لباس میں نظر آتی ہے، پابندِ حالات ہوتی ہے اور رسم و رواج کے خلاف بغاوت کا جذبہ نہیں رکھتی۔ وہ اپنے ہی گھر میں رہ رہے پھوپھی زاد بھائی صفدر سے بے انتہا محبت کرتی ہے جو کہ بے باک، بے خوف اور تعلیم یافتہ ہوتا ہے اور اسی سے شادی کرنے کی خواہشمند ہوتی ہے لیکن عالیہ کی والدہ صفدر سے بے حد نفرت کرتی ہے جس کی وجہ سے ان دونوں کا نکاح نہیں ہو پاتا۔ صفدر کو گھر سے نکالنے کے بہانے علی گڑھ پڑھنے بھیج دیا جاتا ہے ادھر تہمینہ دل ہی دل میں اس کے آنے کی آس میں گھر میں زندگی کے سخت ترین دن گذارتی ہے اور اسی آس میں اپنے گھر کے سامنے والے مہندی کے پودے کو پانی دیا کرتی ہے جو کہ دراصل اس کی امید کی آخری کرن کے طور پر موصوفہ نے اس کے ساتھ جوڑا ہے۔ صفدر کی واپسی کے آثار جب پوری طرح معدوم ہو جاتے ہیں تو تہمینہ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف جمیل سے طے ہو جاتی ہے۔ شادی کے دن تک بظاہر وہ کوئی احتجاج نہیں کرتی لیکن عین شادی کے دن خودکشی کر کے اس کا احتجاج روزِ تاباں کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ صفدر کے گھر چھوڑے جانے کے بعد تہمینہ کے برتاؤ سے اس کے بارے میں یوں تو لاپرواہی والا رویہ دیکھنے کو ملتا رہے لیکن خودکشی کی عین والی رات اس کی عالیہ سے گفتگو اس بات کو غلط ثابت کرتی ہے۔ تہمینہ اُس رات جو باتیں عالیہ سے کہتی ہیں ان سے صاف جھلکتا ہے کہ تہمینہ کو صفدر سے اب تک محبت ہے اور اسی پاس ولحاظ میں زندگی کا ہی خاتمہ کر دیتی ہے:

> ''عالیہ بٹو۔ سنو! جب میں چلی جاؤں اور تم کو کبھی صفدر ملیں تو میرا ایک پیغام کہہ دینا، کہہ دو گی نا؟" بستر پر لیٹتے ہی آپا نے بڑی بیچارگی سے کہا'' کیا آپا؟ آپا کو عجیب سی حالت میں دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا'' یہی کہ میں ان کو کبھی نہیں بھولی بس۔'' [19]

کسم دیدی اس ناول میں ایک ہندو بیوہ کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ہندو مذہب میں چونکہ دوسری

شادی کی اجازت نہیں ہوتی ہے لیکن وہ اپنے مذہبی روایات کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر ایک نو جوان کے ساتھ بھاگ کر گویا اپنے مذہب سے بغاوت کرتی ہے مگر اس کی یہ بغاوت اس وقت المیہ کی صورت اختیار کر جاتی ہے جب وہ مرد اس کو رسوا کن حالت میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو ہر کوئی کسم کو ہی مورِدِالزام ٹھہراتا ہے، اس کو لعن وطعن کرتا ہے۔ کسم یہ بے عزتی سہ نہیں پاتی اور ایک دن بے بس و بے سہارا ہو کر تالاب میں چھلانگ مار کر جان دے دیتی ہے۔ غرض یہ کہ تہمینہ اور کسم اس ناول کے نسوانی کرداروں میں سب سے زیادہ مظلوم کردار ہیں جن کو مردوں کی طرف سے دھوکہ ہو جاتا ہے اور انہیں بالآخر خودکشی کرنا پڑتی ہے۔ ان دونوں کے کردار اردو ادب کے مظلوم ترین کرداروں کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ محبت اگرچہ ایک فطری جذبہ ہے اور ہر ایک کو کسی نہ کسی سے محبت ہو ہی جاتی ہے لیکن ان دونوں کے لیے یہ جذبہ موت کا سبب بنتا ہے۔ ان کی زندگیاں محبت سے خالی ہوتی ہیں اور اس چیز کو پانے کی تلاش میں مردوں کے ساتھ تعلقات قائم کرتیں ہیں لیکن دونوں کو دل کے اس کھیل میں دوکھا ملتا ہے اور زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑھتا ہے۔ اس طرح ماضی کے یہ دو قصے عالیہ کی زندگی کو چھوٹی عمر میں ہی بالغ بنا دیتے ہیں۔ ان دونوں کا حشر اس کو مردوں کی محبت سے متنفر کر دیتا ہے اور پھر وہ پوری زندگی میں کسی مرد کی محبت کا یقین نہیں کرتی۔

کریمن بوا اور عالیہ کی دادی کے کردار بھی اس ناول کے نسوانی کرداروں میں اہمیت کے حامل ہیں۔ دونوں اپنے طاقت کے حساب سے اپنے ماتحتوں پر وقتاً فوقتاً زور آزمائی کرتی ہیں۔ کریمن بوا جو کہ عالیہ کی دادی کے ساتھ بطور جہیز بن کر آئی تھیں۔ اس گھر میں نوکرانی کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ اس کا کسی پر زور نہیں چلتا تھا لیکن اسرار میاں پر وہ خوب زور آزمائی کرتی تھیں جو کہ عالیہ کے دادا کی داشتہ کے اولاد میں سے تھا۔ کریمن بوا اسرار میاں کے بغیر ہر کسی کو نہایت ہی شفیق اور مہربان نظر آتی ہے لیکن وہ اپنا غصہ ہر بار اسی پر اُتارتی ہے۔

مسز ہاورڈ کا کردار ناول ''آنگن'' کے نسوانی کرداروں میں سے ایک اہم اور منفرد کردار ہے یہ موصوفہ کے کرداروں میں اس لیے اہم ہے کیونکہ یہ اس کے ناولوں کا خالص انگریز نسوانی کردار ہے۔ اس کا کردار براہِ راست انگریز عورتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے کردار میں بلاشبہ ایک ایسی عورت اُجاگر ہوتی ہے جو تہذیبوں کے مابین فرق واضح کرتی ہے اس کا کردار چونکہ موصوفہ نے انگریزوں کی نمائندگی

کے لیے خلق کیا ہے اس لیے اس کی مشرقی تہذیب کے تئیں شدت اماں عالیہ اور نجمہ پھوپھی سے زیادہ ہے۔اماں عالیہ اور نجمہ پھوپھی جب مشرقی تہذیب کو ہدفِ تنقید بناتی ہیں تو وہ اعتدال کی راہ کو پار نہیں کرتی دوسری جانب جب مسز ہاروڑ مشرقی تہذیب کو ہدفِ تنقید بناتی ہے تو تحقیر اور تذلیل سے بھی گرے ہوئے الفاظ استعمال کرتی ہے۔ایک مثال رقم کی جاتی ہیں:

" آپ لوگوں سے مل کر بہت کھوش ہوا ہے۔آپ کا گھر بڑا اچھا ہے بڑا صاف ہے۔دوسرا یہاں کا لوگ تو بڑا گندا گھر رکھتا ہے۔بڑا بڑا بیگم بھی گھر صاف نہیں رکھتا، ہم پھر جرور آئے گا آپ لوگ کے پاس"۔ [20]

مسز ہاروڑ کا مشرقی گھروں پر طنز دراصل مشرقی تہذیب پر طنز ہے۔اس بات سے اس کا مشرق کے تئیں نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے۔موصوفہ نے مسز ہاورڑ کے کردار سے ایک تو مشرقی تہذیب پر فرنگیوں کی طرف سے بلا کا طنز دکھایا ہے۔دوسرا اس نے اس کردار کے ذریعے سے انگریزی اردو کے ملے جلے الفاظ کا استعمال بھی دکھایا ہے:

''آپ لوگوں سے مل کر ہم بہت کھوش ہوا ہے۔۔۔۔۔''

تم ہمارے پاس بیٹھنا مانگتا عالیہ؟۔۔۔۔

آپ کا لڑکی بڑا ہوشیار ہے، کھوب پڑھتا ہے۔'' [21]

ناصد ہزاری، اپنی کتاب Midnights Furies میں تقسیم کے پسِ منظر اور بعد کی صورت حال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Gangs of killers set whole villages aflame, hacking to death men and children and the aged whilẹ carrying off young women to be raped.Some British soldiers and journalists who had witnessed the Nazi death Camps acclaimed Partition,s were worse".

(The great divide,william Dalrymple The new yorker,Books june 29,2015 issue).(22)

(یعنی قاتلوں کے گروہ نے پورے گاوں کو نذرِ آتش کیا،مردوں ،بوڑھوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اُتارا دیا جبکہ جوان عورتوں کو آبرو ریزی کے لئے ساتھ لے گئے ۔برطانیہ کے کچھ سپاہی اور صحافی جو کہ نازی حکومت کے بہیمانہ قتل کے شاہد ٹھہرے ہیں،تقسیم کے مظالم کو اس سے بھی بدترین مانتے ہیں)۔ ۲۲

۱۹۴۸ء میں ہونے والی دل دہلا دینے والی ہجرت نے لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ لوگوں کو ایک خطے کو چھوڑ کر دوسرے خطے میں منتقل ہونے پر مجبور کیا اور اس ہجرت میں دولاکھ کے لگ بھگ لوگ جان بحق ہوئے ۔یہ تقسیم برصغیر ہندو پاک کا ایک ایسا واقعہ سامنے آیا جس کی وجہ سے جدید برصغیر پوری دنیا میں جانا جاتا ہے جس طرح' ہالوکاسٹ' Holocaust یہودیوں کے لیے پہچان بن چکا ہے جس میں لوگوں کو بے دردی سے ظلم کی بٹھی میں جھونک دیا جاتا تھا۔ پاکستان کی مشہور زمانہ تاریخ داں عائشہ جلال نے تقسیم برصغیر کے عظیم حادثے کو بیسویں صدی کے درمیان میں جنوبی ایشیا کا ایک سلگتا ہوا تاریخی واقعہ گردانا ہے۔وہ لکھتی ہے:

"A defining moment that is neither begining nor end,partition continues to influence how the peoples and states of post colonial South Asia envisages their past,present and future". (22)

(یعنی تقسیم کے المیے نے لوگوں کی زندگیوں کو اسی طریقے سے اثر انداز کیا جس طریقے سے جنوبی ایشیا کے نوآبادیاتی نظام نے لوگوں کی زندگیوں کے ماضی،حال اور مستقبل کو تبدیل کیا اور جس کا کوئی مخصوص آغاز تھا اور نہ ہی انجام) ۲۲

اوائل حکومت اور اپنے دورِ حکومت میں تو فرنگیوں کو بہت ساری تشدد بھری بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن جب وہ یہاں سے جارہے تھے تو ان کو کسی بھی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا اس دوران صرف سات زخمی ہوئے ۔دراصل واقع کچھ یوں ہے کہ متحدہ ہندوستان ایک ترقی یافتہ ملک تھا جس کو ترقی اور مال ومتاع کی وجہ سے اک دور میں "سونے کی چڑیا" کہا جاتا تھا۔اس لیے دنیا کے بہت سے مما لک یہاں اپنے اپنے

مقاصد کے حصول کے لیے آتے تھے۔انگریزوں نے بھی اسی سلسلے میں یہاں کی سرِ زمین پر بحیثیتِ تاجر اپنے قدم ٹکائے اور کلکتہ میں اسی غرض سے اپنے طرز کی پہلی کمپنی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی بنیاد ۱۶۷۶ء میں ڈالی۔مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ انگریز یہاں کے چون و چرا میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے۔اس زمانے میں انگریزوں کا ایسے پھیل جانا کوئی حیرانگی کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ ہندوستان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور یہاں کا اتحاد و اتفاق درہم برہم ہو چکا تھا یہاں کی معیشت اور معاشرت کی دھجیاں اُڑ گئیں تھیں اور ملّی سطح پر بھی ہندوستان میں کوئی اتحاد واتفاق کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔اس سلسلے میں انگریز جو کہ یہاں کی دولت وشہرت سے پہلے ہی واقف تھے انہوں نے اپنے لیے یہاں آزادی پا کر خوشی کا مظاہرہ کیا مگر اس سب کے حصول میں ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ یہاں پوری طرح اپنی کامیابیوں کے در کھولے یہاں کے سماج کی بگڑی ہوئی حالت پہلے سے ہی ان کی کامیابی کے لیے سازگار تھی اب اگر کسی کسی جگہ اتحاد واتفاق کی بھنک تک تھی اس میں وہ آہستہ آہستہ پھوٹ ڈالنے کی ترکیبیں کرنے لگے اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔یہاں اگر چہ بہت سے چھوٹے چھوٹے اقوام کے لوگ رہ رہے تھے مگر انگریزوں نے یہاں کے دو بڑے اقوام ہندو اور مسلمانوں کو ہی مہرہ بنایا، یہاں کے حکماء جو کہ پہلے ہی ایک دوسرے کے حسد میں جل رہے تھے اور ایک دوسرے کی جان لینے پر تلے ہوئے تھے، ہمیشہ آپسی رسہ کشی میں مشغول رہتے تھے۔انگریز جو کہ اس چیز کی طاق میں بیٹھے ہوئے تھے ،انہوں نے غیر محسوس طریقے سے یہاں کے تمام حکمرانوں کو اپنے بس میں کیا اور اپنے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنا کر چھوڑ دیا۔ایک تو یہاں کی پوری دولت پر قبضہ جمایا،لوگوں کی گردنوں میں غلامی کے طوق ڈال دیئے، پھر کچھ وقت کے بعد یہاں کے لوگ خوابِ غفلت سے بیدار ہو بھی گئے لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی مگر جیسا کہ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ بغاوت آخر کار ناکام کر دی گئی۔اس کے جواب میں پھر ہندوں اور مسلمانوں یعنی دونوں قوموں کو دردناک سزائیں دی گئیں لیکن مسلمانوں پر جو قہر ڈھایا گیا اُس کا نظارہ چشم فلک نے آج تک نہیں کیا ہے۔بقولِ شان محمد:۔

"انگریزوں کے ظلم نے نادرشاہ اور تیمور کے ظلم کو شرما دیا۔ ہندوؤں کے منہ میں گائے کا گوشت اور مسلمانوں کو سور کی کھال میں بند کر کے زندہ جلا دیا گیا"۔ [۲۳]

بغاوت کے دوران انگریزوں نے جو بات سب سے زیادہ محسوس کی وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آپسی بھائی چارہ اور اعتماد تھی۔ اس لیے انگریزوں نے اسی دن سے یہ بات ٹھان لی کہ ان کے درمیان اس جذبے کو ختم کرنا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے یہاں کے سماج میں سے ہی خصوصی طور پر ہندووں اور مسلمانوں میں سے ایسے عناصر تلاش کئے جنہوں نے مذہبی معاملات پر علحیدگی اور تقسیم در تقسیم کے جذبے کو ہوا دی، قوم پرستی کے رجحان کو بھی سرد کیا ''پھوٹ ڈالو حکومت'' کرو اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس پالیسی کے تحت انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی جگہ ہندووں کو بڑے بڑے عہدے دے دیئے جس کی وجہ سے مسلمان بے یارو مددگار پیچھے رہ گئے۔ پھر کانگریس کا قیام، بنگال کی تقسیم، بال گنگادھر تلک کی گاؤکشی کے خلاف تحریک، بنارس میں اردو زبان کا مسئلہ اور آخر میں مسلم لیگ کے قیام نے جلتے پر تیل کا کام کیا، جس کی وجہ سے انگریز اپنے بچھائے ہوئے جال میں آسانی سے کامیاب بھی ہوئے اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں ہو گئے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ انگریزوں نے کیسے اپنی کامیابی کے لیے یہاں پر ہندو مسلم منافرت کو ہوا دے کر اپنے لیے میدان صاف بنایا۔ ڈاکٹر قدوس جاوید اس تناظر میں اپنی کتاب "ادب اور سماجیات" میں لکھتے ہیں:

'' غدر ۱۸۵۷ء ہندوستان میں قومی بیداری کا نقط آغاز تھا۔ اس قومی بیداری نے شروع ہی میں ملک کی مکمل آزادی وخودمختاری کو اپنا نصب العین بنایا تھا لیکن سماجی وثقافتی نقط نظر سے متحدہ نظم وفکری معاشی و سیاسی اعتبار سے منتشر و بے دست و پا ہندوستانیوں نے اس قومی شعور اور جذبۂ آزادی کی بیخ کنی کے لیے برطانوی سامراج کے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی سطح پر جو سازشیں کیں ان کے نتیجے میں رفتہ رفتہ قومی شعور، فرقہ وارانہ شعور اور قومی مفاد اتحادی ہوتے چلے گئے اور آخر کاری فرقہ وارانہ کشیدگی اور تصادم کی ایسی فضا قائم ہوئی جس نے فرقہ

وارانہ بنیادوں پر ملک کو تقسیم کروا کر ہی دم لیا۔'' [۲۴]

ایک مدت سے آزادی کی جنگ لڑنے کے بعد بالآخر برصغیر ہند و پاک نے انگریزوں کے پنجوں سے ۲۰۰ سال بعد ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کر ہی لی۔ آزادی اگرچہ اپنے ساتھ خوشیوں اور شادمانیوں کی بہاریں ساتھ لاتا ہے اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی کرن کی مثل ہوتی ہے مگر ہندوستان کی آزادی میں ایسا کچھ دیکھنے کو نہیں ملا جونہی انگریزوں سے چھٹکارا حاصل ہوا تو دوسری طرف فرقہ وارانہ فسادات نے ایسے سر نکالا کہ انسانیت کے دشمنوں نے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ اس عرصہ میں برصغیر میں جو تباہی و بربادی ہوگئی اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

خدیجہ مستور کے ناولوں کا نفسِ موضوع یوں تو تقسیمِ ہند اور اس سے پیدا شدہ حالات ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عورت کی مظلومیت کی داستان بھی بیان کی ہے، ان کو سراپا جدوجہد کرنے والی بنایا ہے اور مرد اساس معاشرے میں اپنی منفرد شناخت کا درس دیا ہے۔ اس نے دونوں ناولوں میں نسوانی کرداروں کے ذریعے ہی تقسیم کے المیے کو پیش کیا ہے اور اس بات کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے کہ ایک طرف یہ عورت جہاں متحدہ ہند میں اپنی مرضی کی مالک تھیں اور کوئی بھی چیز اس کی توقع کے خلاف واقع نہیں ہوتی تھیں وہیں دوسری طرف تقسیم ہند کے بعد ساری چیزوں کی طرح ان کی حالت میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اب ان کو محض سامانِ تعیش و تفنن ہی سمجھا جانے لگا، دونوں ممالک میں سے عورتوں کی بازآبادکاری کے لئے کوئی نمایاں اقدام نہیں کر پایا جس وجہ سے ان کی حالت روز افزوں بگڑتی گئی اور آخر کار بگڑتے بگڑتے صرف مردوں کی تسکین کے لئے رہ گئیں۔

ناول ''زمین'' موصوفہ کے ناول ''آنگن'' کی ہی توسیع ہے اس وجہ سے موصوفہ کے دونوں ناولوں کے کرداروں میں بھی بہت حد تک مماثلت دیکھنے کو ملتی ہے ناول آنگن کا خاتمہ تقسیم ملک پر ہوتا ہے اور نسوانی کرداروں میں صرف عالیہ اور اس کی والدہ ہی پاکستان ہجرت کرنے کے بعد وہاں سکونت پذیر ہونے میں کامیاب ہوتی ہے یہاں پر یہ بات خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ تقسیم سے پہلے عورتوں کی منجملہ صورتحال اطمینان بخش تھی اور موصوفہ نے بھی اسی حوالے سے ناول آنگن کے نسوانی کرداروں کو برتا ہے لیکن جونہی تقسیمِ برصغیر کا واقع رونما ہوا حالات نے بھی نیا رخ موڑ لیا، تمام چیزوں کی کایا پلٹنے کے ساتھ

ساتھ عورتوں کی کایا بھی پلٹ گئی۔ موصوفہ نے اپنے دوسرے ناول میں تقسیم کے بعد کے حالات کو جگہ دی اور ایسے کردار لائے جن سے اس دور کی حقیقی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ موصوفہ نے اپنے دوسرے ناول زمین میں ایسے نسوانی کردار برتے ہیں جن سے اس دور کی عورتوں کی تصویر آنکھوں میں سما جاتی ہے۔

ناول ''زمین'' کے کرداروں میں ساجدہ، تاجی، سلیمہ، خالہ بی، اماں بی اور لالی کا کردار قابل ذکر اور قابلِ مطالعہ ہے۔ ساجدہ ناول ''آنگن'' کی ہیرائن عالیہ کا توسیع شدہ کردار نظر آتا ہے۔ ساجدہ میں منجملہ طور پر وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو عالیہ میں پائی جاتی تھیں۔ وہ بھی عالیہ کی طرح سنجیدہ، پختہ سوچ اور گہری آگہی کی متحمل ہے۔ ناول میں ساجدہ کے کردار کا تعارف ایک مہاجر لڑکی کے طور پر ہوتا ہے جو اپنے والد رمضان کے ساتھ لاہور کے والٹن کیمپ میں مقیم ہوتی ہے۔ مہاجر کیمپ میں وہ بہت ساری مشکلات سے دوچار ہوتی ہے اور ناظم نام کا شخص جو کہ محکمۂ بحالیات میں ملازم ہوتا ہے ان کی امداد کرنے کے لیے بار بار اس کیمپ کا دورہ کرتا ہے۔ اس کو مہاجرین سے غائت درجے کی انسیت ہوتی ہے۔ ساجدہ کے والد کا جب انتقال ہو جاتا ہے تب ناظم اس کو خالہ زاد بہن کی بیٹی سلیمہ کے ہمراہ اپنے گھر لے جاتا ہے یہاں پر بھی اس کو اگرچہ سکون فراہم نہیں ہوتا لیکن رہنے کے لئے کم سے کم ایک چھت مل جاتی ہے۔ وعدے کے مطابق وہ اپنے عاشق صلاح الدین کا انتظار کرتی رہتی ہے لیکن وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور جب آتا بھی ہے تو ایک بڑے زمیندار کے روپ میں جہاں پر اس کو مادیت کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا ہوتا ہے۔ غرض بہت سے انتظار اور ناظم کے بھائی کاظم کے ظلم سہہ کر ساجدہ آخر کار ناظم سے شادی کے لیے راضی ہو جاتی ہے اور پھر اس کی زندگی میں خوشیاں لوٹ آتی ہیں جو اس کے چہرے سے تقسیم کے بعد غائب سی ہو چکی تھیں۔

ساجدہ کا کردار تقسیم کے دور کی ان عورتوں کا نمائندہ کردار ہے جنہوں نے تقسیم کی صعوبتوں اور آزمائشوں کو سہا اور ہجرت کی لیکن اپنے اصولوں سے سودا نہیں کیا۔ ان جیسی عورتوں کو اگرچہ تقسیم کے دوران مصائب و مشکلات سے سابقہ پڑا لیکن وہ ڈٹی رہیں۔ اس کے کردار میں تقسیم کے المیے کے دکھ، درد اور خواہشات کی قربانیوں سے بحث کی گئی ہے۔

سلیمہ ناظم کے والدہ کی خالہ زاد بہن کی بیٹی ہے اس کا کردار ناول میں خود دار، بے باک اور نڈر کردار ہے۔ وہ حالات سے گھبرا کر میدان چھوڑ کر بھاگ نہیں جاتی بلکہ مقابلہ کر کے ان کے ساتھ نبرد آزما ہوتی ہے اور فتح پا کر ہی دم لیتی ہے۔ وہ جب تک گھر میں رہتی ہے کاظم کو اپنے اوقات میں رکھتی ہے اور جب گھر سے بھی نکلتی ہے تو اپنی منشا و مرضی کے مطابق۔ سلیمہ نڈر اور بہادر ہے وہ حالات کے تھپیڑوں سے ڈرتی نہیں بلکہ ان کا دیوانہ وار مقابلہ کر کے اپنی راہ خود متعین کرتی ہے وہ کسی مرد کی محبت کا یقین نہیں کرتی کیونکہ وہ محبت کو بھوک سے تعبیر کرتی ہے اس کو محبت میں کوئی سچائی نہیں دکھتی:

> ''مرد اور عورت کی محبت محض بھوک کا دوسرا نام ہے، اور یہ اتنی خود غرض بھوک
> ہوتی ہے جو سارے رشتوں ناطوں کی محبتوں کو چاٹ جاتی ہے۔ کال پڑ جاتا ہے
> مگر اس محبت کا پیٹ نہیں بھرتا۔'' [۲۵]

خالہ بی کا کردار ناول ''زمین'' کی تیز طرار دلالہ عورتوں کی نمائندہ ہے۔ اس کے کردار کا مطالعہ کرتے وقت ناول ''آنگن'' کی اماں عالیہ کا خیال ذہن میں آتا ہے جس طرح وہ تیز، شرارتی اور فسادی ہوتی ہے اسی طریقے سے خالہ بی کے کردار میں وہ ساری خصوصیات ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اماں عالیہ میں بدلاو سیاسی حالات و واقعات کی وجہ سے آتا ہے جب کہ خالہ بی کے کردار میں ایسا کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا ان کا گھر بھی اگر چہ ہجرت کے بعد کے گھروں کی نمائندگی کرتا ہے مگر اس کی شخصیت کی خرابی اس کی فطرت کی خرابی سے تعبیر کی جاسکتی ہے وہ تیز اور شرارتی ہونے کے ساتھ ساتھ بے رحم اور ظالم بھی ہے۔ وہ اپنی سفاکانہ فطرت کو استعمال میں لا کے ناظم اور کاظم کے والدین میں ناخوشگوار تعلقات کو جنم دیتی ہے جس وجہ سے ان دونوں کے رشتے میں زبردست خلیج پیدا ہوتی ہے۔ خالہ بی کا کردار دراصل قیامِ پاکستان کے بعد ان عورتوں کی نمائندگی کرتا ہے جن کی ازدواجی زندگی ناکام رہی انہوں نے اپنی ناکام ازدواجی زندگی کا بدلہ چکانے کے لیے دوسرے لوگوں کی زندگی اجیرن بنادی۔

اماں بی یعنی صابرہ باجی اس ناول کا بے حد شریف معزز اور دلکش کردار ہے۔ وہ مالک کی بیوی ہوتی ہے لیکن خالہ بی کی کارستانیوں سے جب ان کے رشتے میں دراڑ پڑ جاتی ہے، اماں بی پھر بھی ایک محسنہ کی طرح قربانی پر قربانی دیتی رہتی ہے۔ خاموشی سے مالک سے الگ رہنے لگتی ہے کبھی اُف تک نہیں

کرتی وہ نظر انداز بھی ہو جاتی ہے مگر معمولی سی ناراضگی کے سوا وہ کچھ نہیں کر پاتی البتہ ناظم اس کو دل و جان سے پیار کرتا ہے اور وقتاً فوقتاً اس کو دیکھنے کے لیے بھی جاتا ہے اور اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے:

''کیا آپ کا پاکستان نہیں ہے مگر آپ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان صرف میرا ہے، میرا مقصد ہے کہ نام کی حد تک باقی یہاں جو کچھ ہے وہ سب آپ لوگوں کا ہے۔ آپ ہر وقت میرے دل میں رہتی ہیں امّاں بی! وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا" بات یہ ہے کہ آپ ہمارے ابا کے، میرا مطلب ہے کہ مالک کے تصور میں قید رہیں، کم از کم آپ نے یہ تو سوچا ہوتا کہ میں نے زندگی کے چند سال آپ کی گود میں گزارے۔ کاظم کی طرح میں خالہ بی کی گود میں نہیں پلا۔ میں ہمیشہ آپ کی محبت کا بھوکا رہا مگر آپ۔۔۔'' [۲۶]

لالی کا کردار ناول میں نسوانی کرداروں کے حوالے سے بہت اہم ہے اس کے کردار میں ایسی عورتوں کی نمائندگی ملتی ہے جو تقسیم کے بعد ہنسی خوشی اپنی زندگی گذارتی ہے لیکن جہیز ان کی زندگیوں میں روڑے اٹکاتا ہے اور ہنستی مسکراتی زندگیوں میں شعلے بھڑکاتا ہے۔ لالی اس ناول میں زمیندار کی بیوی ہے۔ ساجدہ جب ان کی ہمسائیگی میں آتی ہے تو دونوں کے درمیان گہری دوستی ہو جاتی ہے، لالی معمولی پڑھی لکھی لڑکی ہے اور ساجدہ سے جلدی متاثر ہو جاتی ہے۔ اس کے شوہر کو جب بھی جہیز کے آٹھ مرلوں کا خیال آتا ہے تو لہولہان کر کے چھوڑ دیتا ہے۔

تاجی کا کردار ناول میں نسوانی کرداروں میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کردار کھلے طور پر قیامِ پاکستان کے بعد مہاجر لڑکیوں کی صورتحال پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کا کردار ہجرت کرنے والی بے بس اور لاچار لڑکیوں کے جنسی اور جسمانی استحصال کی علامت ہے۔ اس کے کردار میں تقسیم کے بعد بننے والے پاکستان کا المیہ ہے جس میں خدیجہ مستور نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے لوگوں کی پاکستان کے تئیں کون کون سی توقعات تھیں۔ لوگ اس ملک کے متعلق اپنی آنکھوں میں جو خواب سجائے ہوئے تھے وہ قطعی طور پر بھی پورے نہیں ہوئے بلکہ ان ارمانوں کا خون ہوا۔ خدیجہ مستور نے تاجی کردار کے ذریعے سے اس المیے کو جس حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے شاید ہی کسی اور نے قیامِ پاکستان کے تعلق سے اتنا مظلوم کردار پیش کیا ہوا:

''میری ماں نے مجھے ایک قافلے کے ساتھ ڈھکیل دیا، کہتی تھی اپنے ملک میں جا کر کسی شریف آدمی کا ہاتھ پکڑ لیجیو، اور پھر وہ کٹرے والے ہاتھ کا تھام کر غائب ہو گئی۔ تاجی ایک دم سسک سسک کر رونے لگی۔''[۲۷]

تاجی اس ناول میں ایک المیے کی نشانی ہے۔ اس کے بھی خواب ہیں، اس کی بھی زندگی ہے مگر مجبوریوں کے سبب وہ اپنی خواہشات قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس المیے کے بدترین کرداروں کی نمائندگی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس دور کے مردوں کی عیاشی اور نئے پاکستانی حاکموں کی بے ضمیری کا واویلا اس ناول میں بدرجہ احسن دیکھنے کو ملتا ہے۔ تاجی کے آخری الفاظ اس کی مظلومیت کو مناسب طور پر ظاہر کرتے ہیں:

''تاجی نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے سیاہ پپڑیائے ہوئے ہونٹ اب بھی لرز رہے تھے۔ وہ تاجی کے ہونٹوں پر جھک گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی گھٹی سانسوں میں وہ بد بدا رہی تھی "اماں۔۔۔۔وہ شریف ہاتھ نہیں ملا۔ اماں! نہیں ملا' کوئی نہیں ملا، پھر آواز ڈوب سی گئی۔''[۲۸]

تاجی کے اس جملے سے اس بات کی صراحت بھی ہو جاتی ہے کہ تقسیم ہند اپنے آپ میں ایک المیہ اُبھر کر سامنے آ گیا۔ دونوں نظریوں کے حامیوں نے جن دو ملکوں کی بنا رکھی پہلے تو ان کے صحیح ہونے پر ہی سوالیہ نشان کھڑا ہوتے ہیں۔ کیونکہ مہاجر لوگوں سے ہجرت کرتے وقت کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ ان کی اپنی مرضی کا اس میں کوئی عمل دخل ہے یا بھی نہیں؟ ان کو کون سی مجبوری ہجرت کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کیا وہ دل سے ہجرت کر رہے تھے یا محض کچھ لوگوں کے دباو کے تحت؟ یا، کچھ لوگوں کی نفرت کے بالمقابل انہوں نے یہ کام انجام دیا؟ اس سب پر ابھی تک فکشن کے تنقید نگاروں کو سیر حاصل گفتگو کرنا باقی ہے۔ کیونکہ فکشن کے تنقید نگار اب تک صرف اس کی ساخت پر ہی اکتفا کرتے نظر آ رہے تھے مگر مہاجرین کے ظاہری حالات و کوائف کے ساتھ ساتھ ان کے باطن اور اندرونی مسائل میں جھانکنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ اس حوالے سے تنقید نگاروں کو ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔ اس دور میں برصغیر کا نقشہ عرب کے اس معاشرے سے سو فی صد مماثلت رکھتا ہے جس دور کو آخری رسول و نبی حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے

پہلے کا دور کہا جاتا ہے اس دور کو تاریخ دان اور سیرت نگاروں نے جہالت کے دور سے تعبیر کیا ہے۔ جس میں انسانوں نے جی بھر کے دوسرے انسانوں پر ظلم اور سفاکیت کے نقوش ثبت کیئے، ہر طرف قتل و گارتگاری کا دوردورہ تھا۔عورتوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک برتے گئے ۔ برصغیر کے لوگوں نے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے تاریخ کے اس سیاہ ترین دور کو بھی ہیچ ثابت کر کے دکھا دیا۔ اس دور میں عورتیں جس عذاب وعتاب کا شکار ہوگئیں اس سے پہلے کسی دور میں نہیں ہوئیں تھیں۔ تاریخ کا غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات اظہر من الشّمس عیاں ہو جاتی ہے کہ اس دورِ سفاکانہ میں عورتوں کو بدترین حالات سے سابقہ پڑا۔ مردوں کی بے ضمیری اور بے غیرتی کے اس دور میں عورت ہی سب سے زیادہ لاچار اور بےبس شے ثابت ہوئی۔ مردوں نے ہر طرف سے ناکامی اور نامرادی دیکھ کر اپنی ذلت کا بدلہ بھی انہیں سے لیا۔ یہ وہیں بیٹیاں تھیں جن کے سروں پر کل تک یہی لوگ دوپٹے رکھا کرتے تھے۔آج انہی لوگوں کے ہاتھوں ان لاچاروں اور بےسہاروں کی عصمتیں تار تار ہو رہی تھیں اوران کی امداد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پتہ نہیں ان حالات میں زمین کیوں نہ پھٹی اور آسمان نے کیوں خون کے آنسو نہ روئے؟ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے یہی صدا بلند کی جا رہی تھی جو بھی مسلمان ہے اس کو مار گرایا جائے، ان میں سے کوئی بچنے نہ پائے اور جو بھی جائے یہاں سے ایسا سبق لے کر جائے جو تا قیامت اس کی نسلیں یاد کریں گی۔ شاہینہ اختر اپنی کتاب میں اسی سلسلے کی ایک کڑی پر بات کرتے ہوئے لکھتی ہے:

> ''ان فسادات میں زیادہ تر بے گناہوں کا قتلِ عام اور عورتوں کا استحصال کیا گیا تھا۔عورتوں کے ننگے جلوس نکالے گئے تھے، ان کی اجتماعی عصمت دری کی گئی تھی، انہیں اجتماعی خودکشی پر مجبور کیا گیا اور ہجرت کے دوران بھی ان کی پامالی کی گئی تھی۔'' [۲۹]

آخر پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدیجہ مستور نے تقسیمِ برصغیر کے المیے کو جس حسن وخوبی سے برتا ہے وہ کارنامہ بہت کم فن کاروں کے ذریعے سامنے آیا۔ ناول پڑھتے وقت ایک قاری کو بلا شبہ اس دور کی حقیقی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ واقعات کے بیان میں مافوق الفطری عناصر سے ایک قاری کو خیالی دنیا کی سیر نہیں کرواتی بلکہ فکشن کو حقیقت کا روپ دے کر حقیقی حالات و واقعات کو پیش کرتی ہے۔ فکشن میں یوں تو حقیقت بیانی بہت مشکل ہوتی ہے لیکن موصوفہ نے اس چیز کو بڑی آسانی سے بلا کسی تعرض کے برتا ہے۔

فکشن کے بارے میں یوں تو اکثر یہی کہا جاتا ہے کہ اس کی سب بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا نام ''فکشن'' ہے ورنہ یہ ''حقیقت'' سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس کو حقیقت کے نعم البدل کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی فکشن (ناول اور افسانہ) تخلیق میں حقیقی واقعہ کو افسانویت (Fictionalisation) کے ساتھ اپنے فن میں برتنے سے اُس کی تخلیقی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ چوں کہ ناول نگار یا افسانہ نگار کسی حقیقی واقعے کو ہی مواد کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اس حقیقی کہانی کو ناول یا افسانہ میں پیش کرتے ہوئے فن کار سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس حقیقی واقعے کو نامانوس بنا کر پیش کرے تاکہ قاری کے لیے اس کا تجزیہ اجنبی اور نیا ثابت ہو جس سے اُسے فکری بصیرت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی حظ بھی حاصل ہو۔ اس عمل یعنی (Defamailiarization) میں کون سا تخلیق کار کامیاب ہوا ہے، یہ تحقیق طلب معاملہ ہے، تاہم خدیجہ مستور کے یہاں اس کی دھوپ چھاؤں کا مشاہدہ جستہ جستہ کیا جا سکتا ہے۔ موصوفہ کو جو چیز باقی فنکاروں سے منفرد بناتی ہے وہ ان کی غیر جانبداری اور بے باکی ہے وہ باقی فنکاروں کی طرح اپنے مذہب یا نظریے کی رو میں بہہ نہیں جاتی بلکہ اپنی فنی صلاحیت سے واقعات کے بیان میں مخلص اور صادق ہے۔ انہوں نے تقسیم کے المیے کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے اور اس کی تاسیس سچ میں غیر جانبداری پر قائم ہے۔ انہوں نے تاریخی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے انگریزوں کو یہاں کے لوگوں کے درمیان خلیج ڈالنے کا ذمہ دار ٹھرایا ہے جس کی وجہ سے یہاں کے مقامی لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپسی دشمن بن گئے۔ ناول ''آنگن'' میں وہ ایک جگہ لکھتی ہے:

''یہ انگریز جاتے جاتے بھی چال چل گیا۔ لوگوں کو گھر سے بے گھر کر گیا۔''[۳۰]

انگریزوں نے ایسی چال چلی جس سے انہوں نے یہاں کی دو محبّ قوموں (ہندو اور مسلمانوں) کو مذہب کے نام پر آپس میں ایسے لڑایا جیسے صدیوں سے ان کے درمیان دشمنی اور رنجشیں چلتی آ رہی ہو۔ جب کہ مشترکہ تہذیب، محبت و اخوت کی ڈور میں بندے یہ لوگ ہمیشہ آپس میں قربان ہونے کے لیے تیار رہتے لیکن انگریزوں کی دوروخی پالیسیاں اس وراثت کو اپنے ساتھ بہا کے لے گئیں۔

ایک طرف موصوفہ نے جہاں تقسیم کے اس المیہ کو اپنے ناولوں میں بڑے ہی فن کارانہ طریقے

سے دردناک اور غمناک لہجے میں بیان کیا ہے وہیں دوسری طرف وہ نسوانی کرداروں کو برتنے میں بھی بڑی مہارت اور زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔انہوں نے تقسیم اور تقسیم سے پیدا شدہ صورتحال کی حقانیت کو سامنے لانے کے لیے نسوانی کرداروں کو مردوں سے بھی زیادہ برتا ہے اور بہرحال وہ اس امر میں کامیاب قرار پائی ہے۔عالیہ،ساجدہ،اماں بی اور کریمن بوا اس کے نسوانی کرداروں میں آئیڈیل کرداروں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔تاجی،تہمینہ اور کسم دیدی کے کردار مظلوم کرداروں کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔اسی طریقے سے خالہ بی،عالیہ کی اماں، نجمہ پھوپھی کے کردار ظالم اور حقارت آموز کردار وں کے بطور پیش کیے گئے ہیں۔غرض موصوفہ نے بہت سارے باغوں سے لئے ہوئے پھولوں سے ایک پُرکشش اور قابلِ تقلید گلدستہ تیار کیا ہے جو سب کے لئے فقید المثال بن گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی اور حوالے

۱۔ (فکر و تحقیق، نئی دہلی، ص۔۱۵۵، اپریل۔جون۔۲۰۱۶)

۲۔ (نیا ادب، پنڈت کشن کول، ص،۴۳،۴۴)

۳۔ ہم عصر اردو ناول ایک مطالع، ترتیب قمر رئیس ایم۔آر پبلی کیشنز، دہلی۔ص ۶۳)

۴۔ (ہم عصر اردو ناول ایک مطالع، ترتیب قمر رئیس، ،ایم۔آر پبلی کیشنز، دہلی، ص۶۳،۶۴)

۵۔ (آزادی کے بعد اردو ناول، ڈاکٹر اسلم آزاد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ،دہلی، ص،۲۹۵)

۶۔ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ص،۱۳،۱۴)

۷۔ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ص،۲۹۷)

۸۔ (اردو کی خواتین فکشن نگار، ترتیب و تہذیب، مشتاق صدف ،ساہتیہ اکادمی، ص،۱۴۴)

۹۔ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ص، ۱۵۵)

۱۰۔ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ص،۲۹۳)

۱۱۔ (بحوالہ فرقہ واریت اور اردو ناول۔محمد غیاث الدین ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۔ص۔۱۰)

۱۲۔ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ص، ۹۸)

۱۳۔ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ص ۱۲۵)

۱۴۔ (اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، نیلم فرزانہ، ،براون بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء، ص، ۲۳۸)

۱۵۔ (تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول، شبنم آرا، ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص،۲۰۳)

۱۶ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ص،۲۱۴)

۱۷ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ص،۱۵۵)

۱۸ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ص۳۴)

۱۹ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ٦۸)

۲۰ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ص،۳۴)

۲۱ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ص،۳۴،۳۵)

22 The great divide,william Dalrymple,The new yorker,Books june 29,2015 issue).

۲۳ (سرسید تاریخی اور سیاسی آئینے میں، بحوالہ تقسیم ہند اور ناول کرماں والی۔ص۔ ٦۳)

۲۴ (ادب اور سماجیات۔ص۔۴۷، بحوالہ تقسیم ہند اور ناول کرماں والی، شاہینہ اختر، میزان پبلشرز، ص،۲۲)

۲۵ (زمینِ، خدیجہ مستور، کتاب والا، دہلی ص،۱۲۲)

۲٦ (زمینِ، خدیجہ مستور، کتاب والا، دہلی ص،۱۲۴۔۱۲۳)

۲۷ (زمینِ، خدیجہ مستو، کتاب والا، دہلی ص،٦۷)

۲۸ (زمینِ، خدیجہ مستوِ، کتاب والا، دہلی ص، ۲۱٦۔۲۱۵)

۲۹ (زمینِ، خدیجہ مستور، کتاب والا، دہلی ص،۹۹)

۳۰ (آنگن، خدیجہ مستور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ص۳۰۸)

ماحصل

انگریزوں کی دوسوسالہ غلامی کی لمبی مدت کے بعد برصغیر ہندوپاک کے لوگوں نے آخرِ کارآزادی کا جام پی ہی لیا اور برسہا برس سے دیکھے ہوئے اپنے خواب کوشرمندۂ تعبیر کرنے میں بہر حال کامیاب رہے۔لیکن سخت جدو جہد اور عظیم قربانیوں سے حاصل شدہ یہ جام اتنا تلخ نکلا کہ اس کی تلخی سے برصغیر کا ہر فردِ بشر عداوت اور منافرت کی بیماری میں مبتلا ہوگیا اور یہ بیماری بالآخر ناسور کی شکل اختیار کرگئی اور اس ناسور نے بہت قلیل مدت میں پورے برِصغیر کے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر جیتے جی ہلاک کر دیا۔اس عظیم حادثے نے مقامی نقشے کو بالکل بدل ڈالا اور پل بھر میں یہاں کی کایا ہی پلٹ دی۔۳ جون ۱۹۴۷ء کو متحدہ ہند کے لوگوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کر لی اور برسوں کی جدو جہد کا ثمرہ پایا لیکن یہ آزادی جہاں ایک طرف شادمانی ومسرت کا پیغام ساتھ لائی لیکن اس سے بڑھ کر یہ ایک المیہ ثابت ہوئی۔ابھی آزادی کا سورج پوری طرح طلوع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ برصغیر کے چون و چرا سے فرقہ پرستی اور منافرت کی آگ رونما ہوئی اور اس آگ نے یہاں کے لوگوں کے احساسات وجذبات کو پژمردہ اور آدھ مرا بنا دیا، یہاں کی روایات،تہذیب وثقافت کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کیا۔فرقہ پرستی کی اس لعنت نے لوگوں کے دل بغض وعناد اور مخاصمت سے بھر دیئے جس کے تحت انسان انسان کا دشمن بن گیا،آسودہ حال تباہ وبرباد ہوگئے،شیر خوار بچے اُبلتی ہوئی تیل کی کڑائیوں کی نذر کئے گئے،لاکھوں دوشیزائیں درندہ صفت انسانوں کی جنسی ہوس کی زد میں آگئی۔جس روشن اور دھمکتی ہوئی صبح آزادی کے خواب لوگوں نے دیکھے تھے وہ داغدار بن کر طلوع ہوئی اور مشترکہ تہذیب کے محبوں کے لئے اس داغدار آزادی سے انگریزوں کی غلامی لاکھ درجہ بہتر تھی جہاں اگر چہ حاکم غیر ہی تھے لیکن آپسی بھائی چارہ اپنے بامِ عروج پر تھا جو آزادی کی آمد کے ساتھ ہی زوال پذیر ہوا۔اس عظیم المیے سے پھوٹنے والے مسائل کے شاخسانے کو اردو ادباء کی ایک کثیر تعداد نے اپنی تخلیقات میں برتا ہے اور اس حوالے سے اچھے اچھے فن پارے منصۂ شہود پر لائے ہیں جو تقسیم کے واقعات پر محیط ہیں۔انہیں چند اہم ناموں میں سے ''خدیجہ مستور'' کا نام بھی ایک مناسب اہمیت کا حامل ہے جس نے تقسیمِ برصغیر سے متعلق حالات و واقعات پر بہترین پیرائے میں

روشنی ڈالی ہے۔مصنفہ کے ناول ''آنگن''اور''زمین''میں تقسیمِ برصغیراورفسادات سے متعلق جن گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے بدقسمتی سے ان گوشوں کومنظرِ عام پرلانے کےتعلق سے ابھی تک کوئی مبسوط کام نہیں ہوا ہےاور یہ موضوع تحقیقی تشنگی کا شکار ہے۔اس موضوع پرصرف اکے دکے مقالات ہی سامنے آئے ہیں۔جو اس موضوع کی وسعت کوکسی بھی طریقے سے اپنے احاطے میں نہیں لے پارہے ہیں۔اس لئے راقم نے اسی موضوع کا انتخاب کیا تاکہ قارئین پراس حوالے سے بہت سارے مخفی گوشے منکشف ہوجائیں۔زیرِ نظرتحقیقی مقالہ اسی وسیع دریا کوکوزے میں بند کرنے کی طرف ایک طالبِ علمانہ پیش رفت ہے۔

میرے مقالے کا عنوان'خدیجہ مستور کے ناولوں میں تقسیمِ برصغیر کا المیہ:نسوانی کرداروں کے حوالے سے'' ہے۔یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تقسیم کا المیہ برصغیر کی تاریخ کا ایک عظیم حادثہ تھا جس نے لوگوں کے تصورات کی تعمیر شدہ عمارت کو پلک جھپکتے ہی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کیااورجنوبی ایشیا کے نقشے پرایک نئے ملک کا اضافہ کیا۔جس کا نقطۂ عروج ہم گذشتہ بیس پچیس برسوں میں اس موضوع کی مناسبت سے لکھی گئی کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

خدیجہ مستور کے دونوں ناول کہکشاں کی طرح روشن وتابناک،آبشاروں کی مانند مترنم اورلالہ وگل کی طرح رنگین ہے دونوں کی زبان میں بڑی سلاست وروانی پائی جاتی ہےاوراسلوبِ نگارش بہت دلکش اوربعض مقامات پرتوجہ آفریں ہے۔غرض خدیجہ مستور نے کاغذ پر جونقش بنائے ہیں وہ لوگوں کے دلوں میں ایسے منتقل ہوگئے ہیں کہ گویامحاکات نگاری کا حق ادا ہوا ہے۔موصوفہ نے تقسیمِ برصغیر کے المیے کوجس حسن وخوبی سے بیان کیا ہے وہ کارنامہ بہت کم فن کاروں کے حصے میں آیا ہے۔ناول پڑھتے وقت ایک قاری کو بلاشبہ اس دور کی حقیقی تصویر دیکھنے کوملتی ہے۔وہ واقعات کے بیان میں مافوق الفطری عناصر سے قاری کوخیالی دنیا کی سیرنہیں کرواتی بلکہ فکشن کوحقیقت کا روپ دے کرحقیقی حالات وواقعات کی طرف توجہ گامزن کرواتی ہے۔فکشن میں یوں تو حقیقت بیانی بہت مشکل ہوتی ہےلیکن اس نے اس چیز کو بڑی آسانی سے بلاکسی تعرض کے برتا ہے۔موصوفہ کوجو چیز باقی فنکاروں سے منفرد بناتی ہے وہ ان کی غیر جانبداری اور بے باکی ہے وہ اکثرفن کاروں کی طرح اپنے مذہب یانظریے کی رومیں بہہ نہیں جاتی بلکہ اپنی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر حقائق سے پُرتخلیقات صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتی ہے۔وہ واقعات کے بیان میں جھوٹ

موٹ کا سہارا نہیں لیتی ہے بلکہ حقیقت بیانی کے طرزِ عمل سے اپنے قاری کو پہلی ہی فرصت میں گرویدہ بنا دیتی ہے۔ اس ناول میں وہ مختلف کرداروں کے ذریعے سے تقسیمِ برصغیر کے حوالے سے اپنی نفرت کا کھل کر اظہار کرتی ہے جو اس کی نظر میں دونوں ملکوں کے لیے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منافرت کی وجہ بنی۔ اس کا موقف یہ ہے کہ عملی طور پر سارے مسلمان پاکستان ہجرت نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی پاکستان میں ان کے لیے اس حوالے سے سیاسی، سماجی اور معاشی تحفظ کا امکان تھا اور تو اور مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جنھوں نے آزادی کی جد و جہد میں بیشمار قربانیاں دیں تھیں اور وہ یہی رہنے پر مصر تھے۔ موصوفہ نے پہلی بار لوگوں کی توجہ تقسیم کی سفاّک حقیقتوں اور المناکیوں کی طرف پھیری۔

تقسیم کے حوالے سے تمام کتابیں ثقاہت وصحت کے اعتبار سے ایک جیسی نہیں ہیں ضخامت و ہئیت واسلوب کے اعتبار سے مختلف ادیبوں وتجزیہ نگاروں نے ان حالات وواقعات کو الگ الگ زاویوں سے پیش کیا ہے۔ خدیجہ مستور نے رومانی، جاسوسی اور ساہسک (Adventurous) وغیرہ موضوعات پر اپنے دور کے معاشرے کے عظیم حادثے کو اپنے قلم کی زینت بنایا ہے۔ ان کے قلم کو بدوِ شعور اور آغازِ تصنیف وتالیف ہی سے اس حوالے سے طہارت میسر آئی تھی۔ اس سے پہلے اکثر ادیبوں نے عورتوں کو 'مافوق الانسان' کے بطور اپنے فن پاروں میں پیش کیا تھا یا وہ اتنی گھٹیا دکھائی جاتی تھی کہ ذلت ورسوائی کے ڈر سے عام انسان ان کے نقشِ قدم پر چلنے سے ہی گریز کرتا تھا یا ان کو اتنا معزز اور عظمت سے پُر دکھایا جاتا تھا کہ انسان ان کو فرشتہ صفت جان کر ان کے نقش کو عکس کرنے سے رہ جاتیں۔ مگر خدیجہ مستور نے عورتوں کو نہ ہی غلو کی خرابیوں سے فرشتہ صفت ہی پیش کیا ہے اور نہ ہی اتنا ذلیل کہ لوگوں کے سامنے حماقت و رسوائی کا تماشہ بن جائیں۔ وہ نسوانی کرداروں کے انتخاب میں بڑی دیدہ ریزی اور احتیاط سے کام لیتی ہے۔ انہوں نے امکان بھر کوشش کی ہے کہ سچے موتیوں کے ساتھ خزف ریزے نہ آنے پائیں۔ جو واقعہ بھی ان کی کتاب میں درج ہو وہ درایت وروایت کی کسوٹی پر پورا پورا اترتا ہو۔ جس کے سارے کرداروں کی زندگی دہشت ناک نہیں بلکہ دلکش ومحبوب ہے۔ انہوں نے مختلف نسوانی کرداروں کے ذریعے سے روایت سے ہٹ کر تقسیم کی ایک نئی اور قابلِ تقلید توجیہہ پیش کی ہے۔ موصوفہ کے ناولوں کی سب سے بڑی خوبی اور انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں باقی فن کاروں کی طرح عورتوں کو روایتی مظلومیت

کے لبادے میں ملبوس نہیں دکھایا ہے بلکہ دونوں ناولوں " آنگن " اور " زمین " میں تمام نسوانی کرداروں کو مردوں کی بیجا حکمرانی سے مبریٰ اور پاک، ان کے خلاف سراپا جدوجہد دکھایا ہے۔ جو مردوں کے ظلم سے دبتی نہیں بلکہ اور بھی نکھر کے سامنے آتیں ہیں۔ کہنا تو یوں چاہیے کہ ان کے اکثر نسوانی کردار مردوں سے بھی زیادہ فعال اور پُرکشش نظر آتے ہیں۔ عورت ہونے کی حیثیت سے خدیجہ مستور نے اپنے نسوانی کرداروں کو جس احساس سے پیش کیا ہے وہ ان کا فنی کمال متصور کیا جانا چاہیے اور جس گہرائی اور گیرائی سے ان کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے وہ کسی مرد فن کار کے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے جملہ نسوانی کرداروں کا ایک ایسا نمونہ ہمارے سامنے چھوڑا ہے جن میں ایک تو سیاسی حالات وواقعات کو برداشت کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مردوں کے بیجا ظلم وستم کے مقابل میں کھڑا ہونے کا حوصلہ بھی۔ مصنفہ نے نسوانی کرداروں کے ذریعے ہی مغربی تہذیب کی مشرقی تہذیب پر اجارہ داری دکھائی ہے اور دوسرا مشرقی عورتوں کے مختلف رجحانات کو بھی سمویا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے سے عورتوں کی جو تصویر قارئین کے سامنے لائی ہے اس سے ہم اس دور کی عورتوں کی صورتحال سے بہ خوبی روشناس ہوتے ہیں۔

تقسیم اور فسادات نے مشترکہ تہذیب کے ان تمام خوابوں کو چکنا چور کیا جو لوگوں نے مل کر آزادی کے تعلق سے دیکھے تھے۔ متحدہ ہند کے عام لوگ ایک طرف انگریزوں کو اپنے دشمن سمجھ کر ان کو ملک بدر کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے دوسری طرف یہاں کے امراء الگ ہی پالیسیاں مرتب کرنے میں مصروفِ عمل تھے۔ ان کی سوچ لوگوں کی سوچوں سے کوسوں دور تھی۔ ان کے دماغوں میں تقسیم کا بھوت سوار ہو گیا تھا اور تقسیم کے بغیر ان کے منہ چین نہیں پا رہے تھے۔ انہوں نے کچھ اپنے مفاد اور کچھ مذہبی جنون میں جو فیصلہ لیا وہ متحدہ ہند کے لوگوں کے لئے مجموعی طور پر نا قابلِ قبول تھا۔ انہوں نے اس فیصلے کو قبول کر کے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے علاوہ اور ان کے خوابوں میں رنگ بھرنے کے علاوہ کوئی کارہائے نمایاں کام انجام کر کے نہیں دکھایا، کیونکہ بانٹنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا جبکہ جوڑے رکھنا ایک مشکل مگر سعادت مندی کا کام ضرور ہوتا ہے۔ اس فیصلے سے مسلمانوں کو اور نہ ہی ہندو قوم کو کوئی بڑا فائدہ ہوا۔ اس جذباتی فیصلے نے صدیوں سے ایک ہی ملک میں رہ رہے لوگوں کو پل بھر میں ایک

دوسرے کا جانی دشمن بنا دیااور یہ فیصلہ ایسے زخم دے گیا جو بعد میں ناسور سے بھی سخت مہلک ثابت ہوئے۔ برصغیر ہند و پاک ایک عذابِ مسلسل میں مبتلا ہو گیا، ایسے مسائل رونما ہوئے جس سے دونوں خطوں کی سالمیت خاک میں مل گئی۔ لوگوں کی عزتِ نفس تو چھوٹی سی بات ہے لوگوں کے جان و مال کا اتنا زیاں ہوا کہ اس کا حساب لگانا بھی دشوار ہے۔ تقسیم کا اصل المیہ یہ نہیں ہے کہ صدیوں سے ایک ساتھ رہ رہے لوگ پل بھر میں الگ ہونے پر راضی ہوئے اور الگ الگ خطوں میں رہنے میں ہی عافیت تصور کرنے لگے۔ بلکہ اصل المیہ تو یہ ہے کہ لوگ جدا ہوتے وقت اپنے حقیقی نفع و نقصان کی تمیز نہیں کر پا رہے؟ صدیوں سے ہم دو محبت کرنے والے مذاہب کے لوگ آخر کس پالیسی کے تحت الگ الگ کئے جا رہے ہیں؟ لیکن! عین تقسیم کے وقت اس طرف کسی کا دھیان نہ گیا ور اگر کسی کو اس کی زہرناکی کی خبر ہو بھی گئی مگر اس نے اس بات کی الم نہ اُٹھائی اس طرح وہ بھی اسی سیلِ رواں کے ساتھ ہی بہہ گیا جو حدِ نگاہ تک کسی منزل سے خالی دھندلا دھندلا سا منظر پیش کر رہا تھا۔ بہر حال اس المیہ نے اجتماعی زندگی پر منفی اثرات مرتب کئے۔ فرنگیوں کی '' پھوٹ ڈالو حکومت کرو'' والی پالیسی نے ہر گھر کو ماتم کدہ بنا کے چھوڑا۔ سالہا سال سے بٹوری ہوئی مشترکہ وراثت کا پل بھر میں قلع قمع ہوا۔ محبت اور انسیت کی ڈور سے جو رشتے صدیوں سے بندھے آرہے تھے لمحوں میں ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔ انگریزوں کی تربیت نے لوگوں کے اذہان میں ایسا زہر گھول دیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں انہیں کو اپنا خیر خواہ مان رہے تھے اور مسلمانوں کو اپنا جانی دشمن سمجھنے لگے۔ اسی طریقے سے عین ہندوؤں کی طرح ہی مسلمان بھی انگریزوں کی شاطر پالیسی کی وجہ سے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات روا رکھنے پر مجبور تھے اور ان ہی کی تربیت کے عین مطابق ہندوؤں کو دنیا کے بڑے جابر اور ظالم سمجھ رہے تھے۔ یہ بات تو کسی سے مخفی نہیں ہے کہ تقسیم ہند کے بعد برصغیر ایک جنگی اکھاڑا بن چکا تھا اسی طریقے سے یہ بات بھی ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ اس خونین کھیل کے پیچھے برصغیر کے کوتاہ نگاہ رہنماوں کے بعد سب سے بڑا ہاتھ انگریزوں کا تھا۔ انگریزوں نے ایک منظّم پالیسی کے تحت لوگوں کی ذہن سازی کی اور جان بوجھ کر ایک طبقے کو دوسرے طبقے پر فوقیت دی۔ ایک کو عزت سے نوازا اور دوسرے کو رسوا کیا۔ گویا ذہن سازی کچھ اس انداز سے کی کہ ایک ہی گھر میں رہ رہے دو مختلف نظریات (مسلم لیگ اور کانگریس) کے لوگ اس سے پہلے اگر چہ ایک دوسرے پر

جان چھڑ کتے تھے لیکن انگریزوں کی پالیسی کی وجہ سے اس طرح کے سارے رشتے ناطے جانی دشمنی میں بدل گئے۔لوگ ایک باقاعدہ اور منظّم طریقے سے ایسے متنفر کئے گئے تھے کہ پرانی دوستیاں ان کو اس بدترین کام کے کرنے سے عاجز نہیں کر پا رہی تھیں۔بہت کم وقت میں دونوں قومیں آپس میں ایسے دست و گریباں ہوگئیں جیسے کبھی عرب کے اوّس اور خزرج کے دو قبیلے ہوا کرتے تھے اور ایک ایک جنگ سالوں تک لڑتے تھے۔انگریزوں کی سازش اتنی سنگین اور مستحکم تھی کہ برصغیر کا کوئی بھی رہنما ان کی اس پالیسی کا توڑ نہ کر پایا، اگر ان کی اس شاطرانہ پالیسی کے کوئی آڑے آیا بھی تو اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔اس لئے اپنی جان و مال کی اماں کے پیشِ نظر کوئی بھی شخص ان سے براہِ راست ٹکر لینے سے گریز ہی کرتا رہا۔دوسری طرف انگریز اپنی پالیسیاں ایسے فطری انداز سے مرتب کرتے تھے کہ لوگوں کو ان سے بڑھ کر کوئی رفیق اور شفیق نظر نہیں آ رہا تھا اور ان پالیسیوں میں ظاہری طور پر کوئی منافقت بھی نظر نہیں آتی تھی، ورنہ روایت یہی رہی ہے کہ ظالم حکومتوں کا تختہ وقت آنے پر مظلوم لوگوں نے ہی اُلٹا ہے لیکن فرنگیوں نے تاریخِ برصغیر میں اس وقت ایک نیا باب رقم کروایا جب وہ یہاں سے بالکل بھی کسی مزاحمت کے بغیر جا رہے تھے بلکہ باضابطہ اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کا وداع کیا جا رہا تھا۔انہوں نے یہاں کے لوگوں کو کچھ اس طرح سے اپنی صلاحیتوں سے مرعوب کیا ہوا تھا کہ یہاں کے لوگ عقل کے کتنے بھی گھوڑے دوڑائیں ان سے مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔اسی وجہ سے یہاں کے لوگ ان کے ہر فیصلے پر لبیک کہنے کے پابند ہو گئے تھے۔اس طرح سے انہوں نے اپنے ارمانوں کو پورا کرنے کے بعد چپ چاپ پتلی گلی سے بھاگ نکلے۔"سونے کی چڑیا" کو 'رزم گاہ' میں تبدیل کر کے اور مشترکہ تہذیب سے آباد سرزمین کو جنگی اکھاڑا بنا کے چلے گئے۔تقسیمِ ہند کے بعد جب اردو زبان و ادب سے وابستہ ادباء اور شعرا نے قلم سنبھالے تو اُن کے سامنے بے گور و کفن لاشوں اور لُٹی پٹی عصمتوں کے ان گنت موضوعات ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔اس حوالے سے مرد اور خواتین تخلیق کاروں نے عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے اس موضوع کو اپنے اوراق کی زینت بنایا ہے۔مردوں نے اپنے فن پاروں میں اس المیہ کو اپنے طرز سے نبھایا ہے وہیں دوسری طرف عورتوں نے بھی اجتماعی صورتِ حال کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ طبقۂ نسواں کے حساس اور نازک جذبات کی مصوری نہایت ہی دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ کی ہے۔چونکہ تقسیمِ برصغیر اور تقسیم سے

پھوٹنے والے فسادات کی بھینٹ زیادہ تر عورتیں ہی چڑھ گئیں لہذا خواتین تخلیق کاروں نے ایک خاص ضابطے کے تحت اس میں نئی جان ڈالی اور حقائق کو کچھ اس طرح منظرِ عام پر لایا ہے کہ خوب خوب حق ادائی ہوئی ہے۔ اگرچہ خواتین فکشن نگاروں میں اس موضوع کے تعلق سے بہت سارے نام قابلِ ذکر ہیں جن میں قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو اور رضیہ بھٹ شامل ہیں لیکن خدیجہ مستور نے جس منفرد اسلوب اور ایک نئے زاوئے سے اس موضوع سے متعلق مخفی گوشوں کو زینتِ قلم بنایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے اپنے دور کے حالات کا بھرپور مطالعہ اور تجزیہ کر کے ناول نگاری کی صنف کو بھی وسعت عطا کی ہے۔ اسی وجہ سے خواتین تخلیق کاروں کی صف میں تقسیم کے حوالے سے خدیجہ مستور کا نام آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کیونکہ انہوں نے اپنے ناولوں میں اس دور کے درد و کرب، عوامی نا آسودگیوں اور معاشی ناہمواریوں کو اپنے تخلیقی وجدان کا حصہ بنایا ہے۔

خدیجہ مستور فنِ ناول کے پیچ وخم پر اچھی گرفت رکھتی ہے۔ وہ اپنے گہرے اور وسیع مطالعے کی وساطت سے قاری کو فن کے گورکھ دھندے میں الجھا کر نہیں رکھتی ہے بلکہ آسان اندازِ بیاں اپنا کر قاری کو پہلی ہی فرصت میں اپنی طرف راغب کرتی ہے اور حقیقت سے بھرا ہوا اپنا پیغام قارئین تک زیبائش و آرائش کے ساتھ موصول کرتی ہے۔ جس سے تخلیق کے خلق کرنے کا بھی حق ادا ہوتا ہے اور قاری کے اس سے فیض یاب ہونے کا بھی۔ ناول ''آنگن'' اور ''زمین'' حقیقت نگاری کی اعلیٰ مثالیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ جن میں مصنفہ نے غیر جانبدارانہ انداز میں ایک مخصوص عہد کو فکشن کے پیرائے میں سمویا ہے۔ مصنفہ چونکہ ان حالات کی براہ راست شاہد رہی ہے اس لیے اس نے اپنے ناولوں میں من وعن ان ہی واقعات کو جگہ دی ہے جو حقیقی زندگی سے ماخوذ ہیں یا کم سے کم حقیقی زندگی سے قریب تر ہیں۔ مصنفہ کے دونوں ناول اگرچہ برابری کے نہیں مانے جاسکتے تاہم یہ بات ضرور ماننا پڑتی ہے کہ دونوں ایک ہی منبع و سرچشمہ سے مستعار ہیں جس کی وجہ سے دونوں میں ایک گہرا ربط پیدا ہوا ہے۔ تجزیہ کرتے ہوئے جب ہم پلاٹ کی بات کرتے ہیں تو دونوں ناولوں کا پلاٹ روایتی مگر پرکشش اور پرتاثیر نظر آتا ہے، ان میں بیانیہ تکنیک کا استعمال ہوا ہے اس لحاظ سے دونوں ناولوں کا پلاٹ مربوط اور مترنم معلوم ہوتا ہے۔ دونوں ناولوں میں قصے میں مختلف النوع جہتوں سے دلچسپی پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ناول 'آنگن' میں قاری

کی توجہ علامتی عنوان آنگن پر گامزن رہتی ہے، جو سچ مچ اس دور کے تمام آنگنوں کا نمائندہ نظر آتا ہے۔اسی طریقے سے ناول 'زمین' میں ایک قاری زمین کے پوشیدہ مفاہیم کی طرف اپنے ذہن کے پر بچھا دیتا ہے اور آزادی کے بعد ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے حاصل شدہ زمین کے ٹکڑوں پر قابلِ قدر مواد ملتا ہے۔ یعنی زمین جو کہ ماں کے سمان (مادروطن) قرار دی جاتی ہے اور جو دونوں ملکوں کو انعام کے طور پر ملی تھی کے ساتھ لوگوں نے کتنا صحیح سلوک کیا سب پر عیاں ہیں۔ایک طرف پاکستان نے اس انعامِ خداوندی (زمین) کے ساتھ لجاجت و بیچارگی کا سلوک کیا اور اس کی تاسیس کے خلاف روشن خیالی ،مغربی طرزِ زندگی، عیش پسندی اور عیاری و مکاری کو اپنے لئے باعث نجات سمجھنا شروع کیا۔دوسری طرف ہندوستان کے لوگوں نے فکر ونظر کی جنگ میں شدت اختیار کر کے صرف مسلمانوں کو ہی اپنا پہلا اور آخری ہدف بنایا۔اس طریقے سے دونوں ملکوں کی آزادی ایک بڑے المیے کا شکار ہوئی اور اس نام نہاد آزادی اور انگریزوں کے قبضے سے چھڑائے ہوئے 'زمین' کے ٹکڑے راحت وسکون کے بجائے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تردد وتجاہل کا ذریعہ بن گئے ۔ماحول کے اعتبار سے دونوں ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ خدیجہ مستور نے ناول 'آنگن' میں اتر پردیش کے ایک مسلم خاندان کے عروج وزوال کو اس ناول کا محور ومرکز قرار دیا ہے، جہاں پر ایک قاری کو تقسیم کے دور کی ہر کوئی بازگشت سنائی دیتی ہے۔یہ خاندان متعلقہ عہد کے جملہ خاندانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔اسی طریقے سے ناول 'زمین' تقسیم کے بعد لاہور کے والٹن کیمپ میں مہاجرین کے مسائل سے متعلق واقعات کی نمائندگی کرتا ہے۔کردار نگاری کے اعتبار سے دونوں ناول یکساں کامیاب نظر آتے ہیں۔دونوں کے کردار متحرک اور فعال ہیں۔ناول 'آنگن' میں عالیہ کے بڑے چچا اور ان کے افرادِ خانہ کی روداد ہے۔عالیہ،جمیل،چھمی ،اسرار میاں،کریمن بوا اور نجمہ اس ناول کے نمایاں کردار ہیں۔ناول 'زمین' کے کرداروں کی سیرت نگاری میں بھی خدیجہ مستور نے ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ناظم ،کاظم ،ساجدہ اور سلیمہ اس ناول کے نمایاں کردار ہیں۔مرکزی اور ضمنی کرداروں کے ہجوم میں ساجدہ کو ہیروین اور ناظم کو ہیرو کا مقام حاصل ہے۔

مکالمہ نگاری،اندازِ بیان،جذبات نگاری اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے بھی ناول آنگن خدیجہ مستور کے فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔اسی طریقے سے ناول زمین کے مکالمے اور کردار ایک قاری کو اپنی طرف مائل کئے

بغیرنہیں رہتے۔ناول کی منظر نگاری عین حالات وواقعات کے مطابق ہےاوراسلوبِ بیان بھی موصوفہ کی شخصیت اوران کی گونا گوں صفات اورمختلف الجہات اہلیتوں کا آئینہ دار ہے۔

خدیجہ مستور نے پہلے اس دور کا مشاہدہ کیا،حالات وواقعات کو جانچا پرکھا تب جا کے اپنے قلم کو جنبش دے کرفن کاری کے میدان میں قدم رکھا۔اس نے اپنے دورِتعلیم سے ہی حالات کے مدو جزر کوقریب سے دیکھا اورفکشن کے ذریعے سے ایسے نتائج اخذ کئے جن سے تقسیم کے دور کا پورا منظرنامہ اپنے حقائق کے ساتھ ابھرکر سامنے آتا ہے۔انہوں نے انگریزوں کی شاطرانہ پالیسیوں کا پردہ فاش کرکے ان سے بچنے کی راہ بھی دکھائی ہے اور برصغیر ہندو پاک کی مشترکہ تہذیب وثقافت کو اپنوں کے ہاتھوں لٹتے ہوئے دکھایا ہے۔دراصل موصوفہ ہم پر یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ انگریزوں نے یہاں آنے کے وقت ہی سیاسی حالات کو بھانپ لیا تھا اور پھر اقتدار میں آ کے انہوں نے ان تمام خدشات وخطرات کو دور کیا جو ان کو راستے میں رکاوٹ لگ رہے تھے۔انگریزوں کی سیاسی برتری نے سرزمینِ ہند میں جو نئے گل بوٹے کھلانے شروع کردیے تھے ان میں انگریزوں کی زیرکی کے ساتھ ساتھ یہاں کے مغل حکمرانوں کی بےعملی اورامیروں،وزیروں کی آپسی رسہ کشی اورپیشکش کو براہِ راست عمل دخل تھا۔۱۸۵۷ء کی بغاوت سے ان پر یہ پورا واضح ہوگیا تھا کہ یہاں کی مشترکہ تہذیب وتمدن ہی ان کی حکومت کے لیے واحد خطرہ ہے اس لئے انہوں نے اسی دن سے اس کے خاتمے کے لئے اقدامات کرنا شروع کئے۔انہوں نے طرح طرح کی پالیسیاں مرتب کرکے یہاں کی مشترکہ تہذیب کا قلع قمع کیا،دھیرے دھیرے انہوں نے یہاں کے لوگوں میں وہ زہر گھول دیا جس سے ان کی حکومت سازی صاف ہوگئی۔وہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ اگر برصغیر میں مختلف مذاہب کے لوگ کندھے سے کندھا ملا کر ہمارے خلاف سینہ سپر رہے تو ہم یہاں پر تادیر اپنی حکمرانی نہیں چلاسکیں گے،اس کے توڑ اوراپنی کامیابی کے در کھلے رکھنے کے لئے انہوں نے مختلف النّوع چالیں مرتب کیں اوران سب چالوں اور پالیسیوں میں موثر ترین پالیسی ہندو مسلم اتحاد کا توڑ اور مشترکہ تہذیب کے تئیں یہاں کے لوگوں میں نفرت پھیلانا تھا۔اس سازش کے رچانے کے لئے انہوں نے پہلے یہاں اپنا تعلیمی مواد تقسیم کیا،مشنری اسکولوں میں بچوں کو نصاب میں ایسے اسباق رکھے جن سے دونوں متحدہ قوموں کے درمیان ایک خلیج حایل ہوئی۔یہ خلیج جو انگریز دن دہاڑے یہاں کے لوگوں کے

درمیان ڈال رہے تھے یہاں کے لوگ سمجھنے سے آجز تھے۔دونوں قومیں انگریزی تہذیب اور حکومت سے اتنے مرعوب ہو چکے تھے کہ دونوں اب ان کو ہی اپنا نجات دہندا سمجھ رہے تھے اور ان کے ہی رحم و کرم پے جی رہے تھے۔کسی میں یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ان کی حقیقت کا پردہ فاش کرے اور لوگوں کو ان کی عیاری اور مکاری سے باز رکھے۔سارے لوگ اس کے بجائے آپسی منافرت کو ہی ہوا دینے میں مگن تھے۔ ہندوؤں نے اپنے طور سے یہ عہد کیا تھا کہ اپنے خطے میں کسی بھی مسلمان کا نام ونشان تک نہ رکھیں گے اسی طریقے سے مسلمانوں نے بھی یہ عہد کیا تھا کہ اپنے خطے میں ہندوؤں کا صفایا کرکے چھوڑیں گے۔تاریخِ بر صغیر کے بدترین فسادت کا آغاز اسی ذیل میں ہوا جس میں لاکھوں انسانوں کی جانوں کا زیاں ہوا، بے تحاشہ املاک کو نذرِ آتش کیا گیا اور اسی سلسلے میں تاریخِ برصغیر کی سب سے بڑی ہجرت کا آغاز بھی ہوا۔اس ہجرت میں لوگوں کو بے حد مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔تاریخ کی اس سب سے بڑی ہجرت کا المیہ یہ رہا کہ ہجرت کرنے والوں کو گردِ سفر کے علاوہ شاید کچھ ہاتھ نہ آیا۔نئے ملکوں میں بہت کم لوگ خوشحال زندگی بسر کرسکیں کیونکہ اپنے اپنے ملکوں کے حصول کے لئے دونوں اطراف کے لوگوں کو اپنے عزیزوں کو کھونا پڑا اور املاک و اولاد کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ہجرت کے دوران اگرچہ کچھ لوگ مادّی وسائل اکھٹا کرنے میں کامیاب رہے لیکن روحانی سکون ان کو بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ ان مادّی چیزوں کے پیچھے بے گناہوں، لاچاروں اور مجبوروں کا خون کارفرما تھا۔

خدیجہ مستور تقسیم کے المیے کو انگریزوں کی دین قرار دیتی ہے۔وہ اپنے دونوں ناولوں میں غیر جانبدارانہ انداز میں حقائق کو سادہ الفاظ میں پیش کرتی ہے۔اس کے دونوں ناول حقیقت نگاری کی اعلیٰ مثالیں ہیں جن میں تقسیم کے متعلق قابلِ اعتبار مواد مل جاتا ہے ان نکات کو ایک قاری رہنما بنا کے اس دور کے معاشرے کی ہو بہ ہو شکل دیکھ سکتا ہے۔اس نے تقسیم کے اپنے نظرئے کو عالیہ اور تاجی کے کردار وں کے ذریعے سے پیش کیا ہے۔عالیہ کی وساطت سے وہ یہ باور کرانے میں بہرحال کامیاب ہو جاتی ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ یکساں طور پر تقسیم کے ذمہ دار تھے۔دونوں جماعتوں نے مقامی لوگوں کو دوالموں کے نیچے جمع کرکے اپنے اپنے نظریہ کی طرف بلانا شروع کیا۔مسلسل جدوجہد اور کمر توڑ محنت کے بعد دونوں جماعتوں کو اپنے اپنے خطوں سے نوازا گیا۔اس بیچ ایسے افراد بری طرح آزمائش وابتلا میں پڑھ

گئے جو مذہبی تعصب سے بالاتر مشترکہ تہذیب پر مبنی ملک کو قائم رکھنے کی امید ظاہر کر رہے تھے لیکن کوئی ان کی بات سننے کے لیے راضی نہ تھا۔ عالیہ جیسے لاکھوں لوگ کسی چمتکار کے منتظر تھے لیکن شومئ قسمت چمتکار تو درکنار کوئی ان کی نمائندگی کے لیے بھی آگے نہیں آ رہا تھا۔ اس طرح سے مشترکہ تہذیب کے داعیوں کے ارمانوں کا خون ہوا اور محض مذہب کے نام پر تقسیم عمل میں لایا گیا۔ جس نے سرحدوں کے ساتھ ساتھ دلوں پر بھی لکیریں کھینچ ڈالی۔ مصنفہ نے جہاں اپنے ناولوں میں بہت سارے پیغامات دینے کی کوشش کی ہے وہاں اس نے اس حقیقت کو بھی باور کرانے کی سعی کی ہے کہ تقسیم کے وقت جو عورتیں اس آس پر ہجرت کر گئیں کہ ہندوؤں سے بچ کر اپنے مذہب کے لوگوں میں تحفظِ ناموس محفوظ رہے گی لیکن ویسا کچھ نہ ہوا۔ جس ڈر کی وجہ سے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کر رہیں تھیں ہجرت کرنے کے باوجود بھی ان سے وہ ڈر ختم نہ ہوا۔ اگرچہ ہندوستان میں ان کی عصمت غیر قوم یعنی ہندوؤں کے ذریعے سے تارتار ہوئی لیکن پاکستان ہجرت کر کے اُن کو اپنے ہی قوم و مذہب کے ماننے والوں نے استحصال کا نشانہ بنایا۔ تاجی کے کردار کے ذریعے سے مصنفہ نے شدت کے ساتھ اس حقیقت کو واضع کرنے کی سعی کی ہے کہ تقسیم کا المیہ یہ رہا کہ نئے ملک پاکستان سے لوگوں نے وہ امیدیں باندھی ہوئیں تھیں جن کا پورا ہو جانا بعید از عقل تھا کیونکہ ہجرت تو آخر وہیں لوگ کر رہے تھے جو پہلے ایک ہی خطے میں پلے بڑھے تھے۔ ایسے میں مہاجر لوگ بنا تربیت اور نظم وضبط کے بغیر ہی ایک ایسے ملک کی بنیاد کیسے رکھ سکتے تھے جس کا دستور پہلے والے ملک سے قطعی جدا ہو۔ جہاں کا رہن صحن الگ الگ ہو۔ نتیجتاً اس نئے ملک میں بھی وہیں حالات جاری رہیں جن کی روک کے لئے اس نئے ملک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تاجی کی مظلومیت اور کاظم کے اُس پر ظلم ڈھانے سے ایک غیر جانبدار قاری کے لئے شاید یہ بات سمجھنی کوئی مشکل نہیں ہے کہ قیامِ پاکستان کا مقصد کہیں نہ کہیں ادھورا رہا۔ ماؤں نے اپنی آبروؤں کا سودا کر کے جس آس سے اپنی بیٹیوں کو پاکستان بھیجا تھا وہ ریت کا ڈھیر ثابت ہوئیں۔ پاکستان میں اس آس کی کوئی لاج نہ رکھی گئی۔ وہاں پر سب کچھ پہلے جیسا ہی رونما ہونے لگا۔

اس تمام تر وضاحت وصراحت سے یہ بات اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ خدیجہ مستور کے دونوں ناول تقسیم کے پسِ منظر اور پیشِ منظر کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مصنفہ نے اپنے منفرد انداز میں یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ تقسیم کے المیے کے ذمہ دار انگریز تھے لیکن شومئ قسمت کوئی

بھی رہنما اس بات کو سمجھ نہ پایا اور ترجیہات کے اس مقدان نے اپنے ساتھ لاکھوں، کروڑوں لوگوں کو تاریخ کے سیاہ ترین حالات سے سابقہ کروایا۔ مصنفہ نے اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ قیامِ پاکستان تو کسی بھی طریقے سے عمل میں آیا اور اس کے قیام کے لیے لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے جانوں کے نذرانے پیش کئے لیکن جس مقصد کے لیے اس پاک سرزمین کا قیام عمل میں لایا گیا تھا وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ وہاں پر اسلامی افکار و خیالات کے حامل رہنماؤں کے بجائے نفس پرست، مادہ پرست اور زن پرست رہنماء ہی اقتدار کی اعلیٰ مسندوں پر براجماں ہوئے۔